

# خانکلم پیریں

مشتاق احمد یوسفی



مُشتاقِ احمد یوسفی

# خاکم بدبین

(خاک کے اور مزاحیہ)

Biggest Urdu Literature & CSS books Library

[www.AdabiZouq.com](http://www.AdabiZouq.com)

حُسامی بُلک ڈپو

پچھلی کھان، حیدرآباد ۲۰۰۰۰۵

---

# جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

---

اشاعت ۱۹۸۴ء

تعداد: ایک ہزار

طباعت گلشن پریس حیدرآباد

ناشر حسامی بک ڈپو

مچھلی کمان، حیدرآباد (انڈیا)

Biggest Urdu Literature & CSS books Library

[www.AdabiZouq.com](http://www.AdabiZouq.com)

ادبی زوق فاؤنڈیشن  
کے نام



# ترتیب

۷	دست زلیخا (دیباچہ)
۱۷	صغے اینڈ سنز
۳۹	سیر، ماتاہری اور مرزا
۶۱	بارے آلو کا کچھ بیسیاں ہو جاتے
۹۳	پروفیسر
۱۱۷	ہونے مر کے ہم جو رسوا
۱۳۵	پل اسٹیشن
۱۶۳	بائی فوکل کلب
۱۸۹	پنڈ تصویرستان

## دستِ لیچل

بابائے انگریزی ڈاکٹر سمویل جانسن کا یہ قول دل کی سیما ہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے، اُس سے بڑا احمق روتے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کلمے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے، بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہے جو ہم سمجھے ہیں، یعنی چمک چمک یا روکڑ بھی۔ دیباچے میں یہ وضاحت از بس ضروری ہے کہ یہ کتاب کس مالی یا الہامی دباؤ سے بڑھال ہو کر لکھی گئی۔ چنانچہ جواہل قلم ذہین ہیں و دشمن کی طرح خود بولتے ہیں۔ جو ذرا زیادہ ذہین ہیں، وہ اپنے کندھے پر دوسروں سے ہندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے منظر ہیں، جو خودکشی میں ہوتے ہیں۔ یعنی تاریخ وفات، آلہ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحب معاملہ خود کرتا ہے۔ اور تعزیراتِ پاکستان میں یہ واحد مجرم ہے جس کی سزا صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ ملزم ارتکابِ مجرم میں کامیاب نہ ہو۔ ۱۹۶۱ء میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمد اللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت بقلم خود نصیب ہو رہی ہے۔ قیثہ بغیر مر نہ سکا کو بہن اسد۔



یہ کتاب چراغِ تلے کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔  
جن دست دربانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی، زندہ دلی اور جواں سالانہ کائنات  
نظر آیا، ممکن ہے، ان کو دوسری میں کھولت کے آثار دکھلائی دیں۔ اس کی وجہ  
ہیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی عمر میں آٹھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

انسان کو حیوانِ ظریف کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے  
اس لیے کہ دیکھا جلتے تو انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس  
ہو جاتا ہے۔ انسان واحد جاندار ہے جسے خلاقِ عالم نے اپنے حال پر رونے کے  
لیے غم و درگم بھجئے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حساس طنز نگار دنیا  
سے یوں خفا ہو جاتے ہیں جیسے لگے وقتوں میں آقا نک حرام کوٹھڑوں سے روٹ  
جایا کرتے تھے۔ لغزش غیر پر انھیں مہی کے بجائے طیش آ جاتا ہے۔ ذہین لوگوں  
کی ایک قسم وہ بھی ہے جو احمقوں کا وجود دیکھنے سے بڑاشت ہی نہیں کر سکتی۔ لیکن  
جیسا کہ مارکوس سید نے کہا تھا، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سبھی انسان احمق  
ہوتے ہیں۔ موقوف نے تو یہ شور بھی دیا ہے کہ اگر تم واقعی کسی احمق کی صورت  
نہیں دیکھنا چاہتے تو خود کو اپنے کمرے میں مقفل کر لو اور آئینہ توڑ کر پھینک دو۔  
لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت، نصیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنے  
اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قدر آدم دیوارِ قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا  
روسے شندان، شورن مٹھی پھول کی مانند، ہمیشہ سرچشمہ نور کی جانب رکھتا ہے  
اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رخ اُس سمت کر لیتا ہے جہاں سے  
وہ چھٹلوع ہوگا :



ہمہ آفتاب بنیم، ہمہ آفتاب گویم  
 نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب کریم  
 جس مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر قسم  
 سے آسان گزر جاتا ہے

بے نشہ کس کو طاقتِ آشوب آگئی  
 یوں تو مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں آسانی حل ہو جاتے ہیں، بالخصوص اُردو  
 ادب میں۔ لیکن مزاح کے اپنے تھانے، اپنے ادبِ آداب ہیں۔ شرطِ اول یہ  
 کہ برہمی، بیزاری اور کدورتِ دل میں راہ نہ پلے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خود  
 شکاری کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مزاح تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی انگلی  
 نہ اٹھ سکے کہ ”یہ دھواں سنا کہاں سے اٹھتا ہے؟“ مزاح نگار اُس وقت تک تبسم  
 زیر لب کا سہرا وار نہیں، جب تک اُس نے دُنیا اور اسل دُنیا سے رنج کے  
 پیار نہ کیا ہو۔ اُن سے۔ اُن کی بے مہری و کم رنگا ہی سے۔ اُن کی سرخویشی و  
 ہشیاری سے۔ اُن کی تردامنی اور قست دس سے۔ ایک پیمبر کے دامن پر  
 پڑنے والا ہاتھ اُستناخ نہ رہے، مگر مشتاق و آرزو مند بھی ہے۔ یہ زلیخا  
 کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چھو کر دیکھنے والا ہاتھ۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی  
 ایک صاحب طرز ادیب نے جو سننِ فہم ہونے کے علاوہ ہمارے  
 طرفدار بھی ہیں (تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سودِ خوار ہوتا — کی حد تک) ایک  
 \* رنج کے (بیجاں) : جی بھر کے۔



رسالے میں دینی زبان سے یہ شکوہ کیا کہ ہماری شوخی تحریر مسائل حاضرہ کے عکس اور سیاسی سوز و گداز سے عاری ہے۔ اپنی صفائی میں ہم مختصراً اتنا ہی عرض کریں گے کہ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مولانا دومیؒ کہ رمز و کنایہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں، ایک اندھیری رات کی بات سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جنگل بیابان میں ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ کر کہنے لگا کہ امی! اندھیرے میں مجھے ایک کار دیو نظر آتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھٹکی بندھ جاتی ہے۔ ماں نے جواب دیا، بیٹا! تو مرد بچہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دکھائی دے، آگے بڑھ کے حملہ کر دینا۔ وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔ بچے نے پوچھا، امی! اگر اس کارے دیو کی امی نے بھی اسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو۔۔۔۔؟

کچھ علاج اس کا بھی اسے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

کچھ دن بعد دوسرا کہ سرخیل دانشوراں تھا اور جس میں راقم الحروف کی سیاسی بے بسی و بے رغبتی کی تشخیص کی گئی تھی، نواب کالا باغ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ ہمارے قدردان نے ایک پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ٹھیکیدار کے ہاں بحیثیت پلٹی منیجر ملازمت کر لی۔ فقیر نے بھی یاران مہرباں اور شہر بے اماں سے رخصت چاہی اور بوریہ بدھنا سنبھال، داتا کی نگری کی راہ لی

اوبسحرافت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

’پروفیسر‘، ’بارے آؤ کا کچھ بیاں ہو جائے‘ اور ’بائی فوکل کلب‘ اسی سفر شوق کی یادگار ہیں۔ پڑھنے والوں کو ان کا رنگ مختلف نظر آئے تو یہ زندہ دلائل لاہو



کافیضانِ صحبت ہے۔

لوگ کیوں کتب اور کیسے ہنستے ہیں؟ جس دن ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہو جائے گا، انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں؟ تو اس کا انحصار حکومت کی تاب و رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔۔۔ پنچ کے لطیفے، موسم، عورت، تجربہ می آرٹ۔ اس کے برعکس ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں جو اب ہماری سمجھ میں آگئی ہیں۔ مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں، بنیادی جمہوریت۔

فقیر کی گالی، عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے آزر وہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قول فیصل ہمارا نہیں، مولانا عبید زاکانی کا ہے (از دشنام گدایاں و سیلی زناں و زبان شاعراں و مسخرگان منجید)۔ مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدہ میں رہتا ہے کہ اس کی فاش سے فاش غلطی کھ بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ممکن ہے اس میں بھی تفتن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو جو غالباً موسم کی خرابی کے سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس بنیادی حق سے دستبردار ہونے بغیر، یہ تسلیم کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ہم زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلفِ زائد تصور نہیں کرتے۔ یہ اعتراف عجز اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض اہلِ تسلیم بڑی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بے دھیانی یا محض آئکس میں صحیح زبان لکھ جائیں تو اور بات ہے بھول چوک کس سے نہیں ہوتی؟



محترم و مکرم جناب شان الحق صاحبِ حقی نے جس توجہ اور محنت سے اس مجسّم کے پانچ مضامین کا مطالعہ فرمایا اس کے لیے راسم الحروف بہترین سپا ہے۔ انھوں نے نہ صرف مفید شواہد سے سرفراز فرمایا، بلکہ یہ کہہ کر مستف کا دل بڑھایا کہ آپ کہیں کہیں گھسے پٹے محاورے استعمال کر جاتے ہیں، مگر آپ کا اطلاق بے حد اور عینِ بل ہے۔ چنانچہ 'مبداء کو' 'مبداء پر'، 'پرواہ کو' 'پرواہ اور'، 'طیرہ کو' 'طیرہ لکھنا' ہم نے انھیں سے سیکھا۔ اور یہ بھی انھیں سے معلوم ہوا کہ 'عطائی' اور 'طوطا' کا صحیح اطلاق 'آئی' اور 'توتا' ہے! جو شِ اصلاح میں ہم تو 'طوائف' کو بھی 'ت' سے لکھنے پر طیار تھے، مگر طوطے والی بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کہ 'توتے' کو اگر ط سے لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ ہر معلوم ہوتا ہے، بلکہ ط کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے۔

اور محبوس کیوں بولیں، 'طوائف الملوكی' کا صحیح مفہوم بھی حقی صاحب ہی نے بتایا، ورنہ ہم تو کچھ اور سمجھے بیٹھے تھے۔ عربی و فارسی میں بس اتنی شد بد ہے کہ میٹرک تک ہم 'ایضاً' کو کسی بسیار گو شاعر کا تخلص سمجھ کر ہر غزل 'ایضاً' پر اپنا خون کھولتے رہے۔ یادش بخیر! راہ زن کے لغوی معنی ہر زمانے اسی زمانے میں زنِ بازاری بتاتے تھے! اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے اس کے صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں، غالب اور آتش کے سرعموں ہو کر اسیرِ وابستہ ہیں راہ زن کے پانوں، اور ہزارہ زنِ امتیاد راہ میں ہے، کا سارا لطف ہی جاتا رہا۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزہ؟ ازبکہ حقی صاحب تحقیق کے مردِ میدان ہیں، انھیں قدیم الفاظ و واقعات کے علاوہ کوئی اور بات مشکل سے یاد رہتی ہے۔ مثلاً وہ یہ فوراً بتا دیں گے کہ 'تین کب



متروک ہوا۔ اُستاد (غالب) کے کلام میں آئینہ کتنی مرتبہ آئی ہے۔ ستم پیشہ ڈوسنی نے مغل بچہ کو کس سندھ میں داغِ مفارقت دیا۔ اُستاد کے مکان کا پتا اور بتایا کرایہ کیا تھا۔ لیکن اپنے مکان کا نمبر بتانے کے لیے انھیں بگیم سے تبادلہ شکوک کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی غیر حاضر دماغی کے لطیفوں کو، سکھوں کے سمجھ کر، خوب محفوظ

ہوتے ہیں۔ ایک دن THE ABSENT-MINDED PROFESSOR فلم کی

پیشگی بکنگ کے 'کیو' میں ملاقات ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کیوسے اس پر بحث کرتے ہوئے گتھم گتھانکے، بلکہ نکالے گئے، کہ صحیح لفظ قمیض ہے یا قمیص۔

مزا سے رجوع کیا تو فرمایا، صحیح پہناؤ ابشرٹ ہے! باہر نکلے تو ہم نے اپنی کار کا دروازہ

کھولا اور حقیقی صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے داخل ہو گئے۔ داخل ہی نہیں ہوئے بلکہ

اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اپنے کوٹ کی اندرونی و بیرونی جیبوں کو کھنگالنے کے

بعد ہاتھ کی اتفاقی رگڑ سے ہماری پتلون کی جیب کو بھی ٹٹول لیا۔ بالآخر اپنے قمیص

کی جیب سے ایک چابی برآمد کی۔ پورا زور لگانے کے باوجود یہ چابی نہ لگی تو فرمایا

کہ اس نامہنجا رڈرائیور کو ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی اور ورکشاپ میں سروس کرائے

جب بھی سروس ہوتی ہے، ایک نئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے ہمت کر کے عرض

کیا، قصور دراصل ہماری کار کے سوراخ کا ہے جو آپ کی چابی میں فٹ

نہیں ہو رہا۔ چمک کر بولے، ہاں! قصور پر خوب یاد آیا۔ آپ نے ایک جگہ

فوتیدگی لکھا ہے۔ یہ مارواڑیوں کی سی اردو آپ نے کہاں سے سیکھی؟ عرض کیا

مارواڑ میں، جہاں ہم پیدا ہوئے۔ یہیں کار سے اُتار کر فٹ پاتھ پر گلے لگاتے

ہوئے بولے، تو گویا اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے! حالانکہ آپ کی



اہلیہ تو اہل زبان ہیں!  
خدا انہیں خوش رکھے کہ انہوں نے ہماری اردو کی نوک پلک سنوارنے  
میں ہماری بیگم کا ہاتھ بٹایا ہے۔

۲۶ سی ۲ - گلبرگ ۲ - لاہور  
۲۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء

مشاق احمد یوسفی

مکڑ رانکہ، رسم دنیا، موقع اور دستور تو نہیں، لیکن قطع میں کچھ ایسی سخن  
گستاخانہ بات آپڑی ہے کہ جناب جمیل احمد قریشی خوشنویس کا قرض اُتارنا لازم ہو گیا۔  
پار سال پہلے اس کتاب کی کتابت کے دوران انہوں نے حاشیہ پرنسپل سے جا بجا اپنے  
ذاتی تاثرات سے خط شکستہ میں آگاہی بخشی (آخر میں تو اوچھے نشانوں پر اُتر آئے  
تھے: !!XV!!) اور نقل کے ساتھ ساتھ کفر کی نشان دہی بھی کرتے رہے  
مثلاً ایک مضمون میں ہم نے اپنے شکار کے سلسلے میں موضع ڈھلم بگتن کا حنا کہ  
اڑایا تھا۔ انہوں نے مسودہ پر قلم پھیرتے ہوئے حاشیہ پر ارقام فرمایا "مگر یہ تو میرا  
آبائی گاؤں ہے۔ اور اس کی جگہ از خود توبہ ٹیک سنگھ جڑ دیا، جہاں غالباً اُن کا سر  
ہے۔ صفحہ ۲۰۷ پر ہم نے لکھا تھا کہ ایک کمیل (FARCE) میں شہنشاہ اکبر نے  
انارکلی کے رُخ زیبا پر اس انداز سے طمانچہ مارا کہ ہمیں تو دُور سے یہی لگا کہ مہابلی  
پانچ منٹ تک انارکلی کا گال سہاتے رہے جمیل صاحب نے طوفان دکر ہا کتابت  
تو کر دی، لیکن پانچ منٹ کے گروپل سے دائرہ کھینچ کر حاشیہ پر اسے نازیبا قرار دیا۔



اس اعتراض کے پیش نظر ہم نے پانچ منٹ کے بجائے دو منٹ کر دیا ہے۔  
 ۱۹۶۵ کی کتابت میں کچھ حصے، کتابت کے لحاظ سے خالص کمزور تھے۔ انہیں  
 ہم نے نکال دیا۔ پھر جمیل صاحب نے چُن چُن کر وہ اوراق علیحدہ کیے جو ان کے  
 نزدیک بلحاظ انشاپردازی خالص کمزور تھے۔ جب دونوں مرحلے بخیر و خوبی اختتام  
 کو پہنچے تو پتا چلا کہ کتاب میں کچھ باقی نہیں رہا، سوائے دیباچہ کے! وہ بھی اس لیے  
 کہ ابھی لکھا نہیں گیا تھا۔

چنانچہ جگر لخت لخت کو پھر جمع کیا۔ جون ۱۹۶۹ میں ساری کتاب کی دوسری  
 مرتبہ بصرف کثیر کتابت شروع ہوئی \* جس کا عکس جمیل پیش خدمت ہے۔  
 جمیل صاحب نے حسب وعدہ چشم پوشی فرمائی۔ لیکن ہم نے بھی اس دفعہ  
 مسودے اور آفسٹ مسطر پر حاشیہ بالکل نہیں چھوڑا تھا۔

یوسفی

\* عرض جمیل : مصنف کو اب بھی  
 حاشی سے اختلاف ہے تو بندہ  
 تیسری دفعہ کتابت کرنے کے لیے  
 تیار ہے۔

جمیل نے زنجیرِ نثر رقم  
 (بقلم خود)



# صبحے آئینہ سنسز

سوداگران و ناشران کتب

یہ اُس پُر امید زمانے کا ذکر ہے جب انہیں کتابوں کی دکان کھولے اور ڈیل کاری کی پڑھے دو تین مہینے ہوئے ہوں گے اور جب ان کے ہونٹوں پر ہر وقت وہ دھلی منجھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جو آج کل صرف ٹوتھ پیسٹ کے اشتہاروں میں نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی باتوں میں وہ اڑ کر لگنے والا جوش اور دلولہ تھا جو بالعموم انجام سے بے خبر۔

دکان کیا تھی، کسی بگڑے ہوئے رئیس کی لائبریری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے جُن چین کر وہی کتابیں دکان میں رکھی ہیں جو خود ان کو پسند تھیں اور جن کے متعلق انھوں نے ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ بازار میں ان کی کوئی مانگ ہے نہ کھپت۔ ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ نے دکان میں قدم رکھتے ہی اپنی تمام ناپسندیدہ کتابیں اس خوش سلیقگی سے بچا دکھیں تو ایک دفعہ اپنی پرانی عینک پر اعتبار نہیں آیا اور جب اعتبار آگیا تو اُلٹا پیار آنے لگا۔ اپنے مخصوص کھٹے لہجے میں بولے ”یار! اگر عام پسند کی بھی دو چار کتابیں رکھ لیتے تو گاہک دکان سے اس طرح نہ جاتے جیسے سکندر دنیا سے گیا تھا۔“ دونوں ہاتھ خالی!

”تاجرانہ عہد کے بعد فرمایا“ میں صرف معیاری کتابیں بیچتا ہوں۔“



پوچھا ”معیاری کی کیا پہچان؟“

ارشاد ہوا ”سنو! میرے ایک قریبی ہمسایے ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس۔  
چوبیس گھنٹے کتابوں میں جُٹے رہتے ہیں۔ لہذا میں نے کیا یہ کہ دکان کھولنے سے پہلے ان سے  
ان کی اپنی پسندیدہ کتابوں کی مکمل فہرست بنوالی۔ پھر ان کتابوں کو چھوڑ کر اردو کی بقیہ تمام  
کتابیں خرید کے دکان میں سجادیں۔ اب اس سے بہتر انتخاب کوئی کر کے دکھاوے۔“  
پھر ایک ایک کتابچہ بنا کر صیغہ جمع میں بنکارے ”ہماری کتابیں اردو ادب کی  
آبرو ہیں۔“

”اور ہم یہ بہت ارزاں بیچتے ہیں! مرزا نے اسی لہجے میں جملہ پورا کیا۔  
مصیبت یہ تھی کہ ہر کتاب ہر مصنف کے متعلق ان کی اپنی رائے تھی۔ بے لاگ اور  
اٹل جس کا اظہار و اعلان بالجہر وہ بمنزلہ دینی فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے  
گاہک کو کتاب خریدنے سے جبراً باز رکھا کہ اس سے اس کا ادبی ذوق خراب تر ہونے کا اندیشہ  
تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کتب فروش کم اور کتب نما زیادہ تھے۔ کبھی کوئی خریدار ہلکی ٹھیکری کتاب  
مانگ بیٹھتا تو بڑی شفقت سے جواب دیتے ”یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر سیدھے ہاتھ کو مرط  
جائیے۔ پرلے نگر پریچوڑیوں کی دکان کے پاس ایک لیٹر بکس نظر آئے گا۔ اس کے ٹھیک  
سلنے جو اونچی سی دکان ہے۔ بچوں کی کتابیں وہیں ملتی ہیں۔“ ایک مرتبہ کا واقعہ اب تک یاد  
ہے کہ ایک صاحب کلیاتِ مومن پوچھتے ہوئے آئے اور چند منٹ بعد مولوی محمد اسماعیل  
میرٹھی مرحوم کی نظموں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے ان کی دکان سے نکلے۔

ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکراتے فرما  
وہ نابالغ شاعر ہے۔ میں سمجھا شاید MINOR POET کا وہ یہی مطلب سمجھتے ہیں۔ میری



حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرمادی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ  
 ٹافی مانگ رہا ہے۔ اس پر میں نے اپنے ایک محبوب شاعر کا نام لے کر کہا کہ بچارے ہوش  
 خلیج آبادی نے کیا خطا کی ہے؟ ان کے مجموعے بھی نظر نہیں آتے۔ ارشاد ہوا کہ اس ظالم کے  
 تقاضاتے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی کابلی پٹھان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر  
 رہا ہے۔ میں نے کہا مگر وہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ بولے ٹھیک کہتے ہو۔ زبان ان کے گھر  
 کی لونڈی ہے اور وہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں! عاجز ہو کر میں نے کہا اچھا،  
 یوں ہی سہی، مگر فانی بدایونی کیوں غائب ہیں؟ فرمایا ہنس! وہ نرے مصوٰرِ غم ہیں! میں نے  
 کہا بجا! مگر مہدی الافادی تو کامل انشا پرہاز ہیں۔ بولے چھوڑ بھی! فانی مصوٰرِ غم ہیں تو مہدی  
 مصوٰرِ مبتعم! واللہ! وہ انشائیہ نہیں، نساۃ لکھتے ہیں۔ بالآخر میں نے ایک جانے پہچانے  
 پروفیسر نقاد کا نام لیا، مگر پتہ چلا کہ انھوں نے اپنے کانوں سے فاضل پروفیسر کے والد  
 بزرگوار کو لکھتو کو نکھلتو اور مزاج شریف کو مجاز شریف کہتے سنا تھا۔ چنانچہ اس پر پانہ نااہلی  
 کی بنا پر ان کے تنقیدی مضامین دکان میں کبھی بار نہ پاسکے۔ یہی نہیں، خود پروفیسر موصوف کے  
 ایک محفل میں ان کے سامنے غالب کا ایک مشہور شعر غلط پڑھا اور دوسرے ہو ہو کر داد و صول  
 کی، سو الگ! میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بولے فرق کی ایک ہاں رہی! میرن  
 صاحب کا قصہ بھول گئے؟ کسی نے ان کے سامنے غالب کا شعر غلط پڑھ دیا۔ تیوریاں چڑھا  
 کر بولے، میاں! یہ کوئی قرآن وحدیث ہے۔ جیسے چاہا، پڑھ دیا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بہت سی کتابیں وہ اس لیے نہیں رکھتے تھے کہ ان کو  
 سخت ناپسند تھیں اور ان کے مصنفین سے وہ کسی نہ کسی موضوع پر ذاتی اختلاف  
 رکھتے تھے لیکن محدود و چند مصنفین جو اس محتوب و منضوب زمے سے خارج تھے، ان



کی کتابیں دکان میں رکھتے ضرور تھے، مگر کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح بکنے نہ پائیں، کیونکہ وہ انھیں بے حد پسند تھیں اور انھیں سنگوا سنگوا کر رکھنے میں عجیب روحانی لذت محسوس کرتے تھے۔ پسند و ناپسند کی اس غیر تاجرانہ کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ

کتاب از جانہ جُنبند!

سُنی سنائی نہیں کہتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوانِ غالب (مُصوّر) دکان میں مہینوں پڑا رہا۔ محض اس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا کہ دکان اس کے بغیر سُنی سُنی معلوم ہوگی۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ان کی مثال اس بد نصیب قصاب کی سی ہے، جسے بکروں سے عشق ہو جائے۔

کتابوں سے عشق کا یہ حال تھا کہ عین بوسہی اور بکری کے اوقات میں بھی مطالعے میں کمر غرق رہتے۔ یہ کمر کمر کی قید اس لیے لگانا پڑی کہ ہم نے آج تک انھیں کوئی کتاب پوری پڑھتے نہیں دیکھا۔ مرزا اسی بات کو یوں کہتے تھے کہ بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو اپنے کو ان سے پڑھوا سکی ہیں۔ یہی نہیں، اپنے مطالعے کی تکنیک کے مطابق رومانوی اور جاہلی ناولوں کو ہمیشہ اُلٹا یعنی آخر سے پڑھتے تاکہ ہیروئن کا حشر اور قاتل کا نام فوراً معلوم ہو جائے۔ (ان کا قول ہے کہ معیاری ناول وہی ہے جو اس طرح پڑھنے پر بھی آخر سے شروع تک دلچسپ ہو۔) ہر کہیں سے دو تین صفحے الٹ پلٹ کر پوری کتاب کے متعلق بے دریغ رائے قائم کر لینا اور پھر اسے منوانا ان کے بانیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو لکھائی چھپائی دیکھ ہی ساری کتاب کا مضمون بھانپ لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ اردو کی ایک تازہ چھپی ہوئی کتاب کا کاغذ اور روشنائی سو نگہ کرنے سے صرف اسے پڑھنے بلکہ دکان میں رکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دشمنوں نے اڑا رکھی تھی کہ وہ کتاب کا سرورق پڑھتے پڑھتے اُونگھنے لگتے ہیں اور



اس عالم کشف میں جو کچھ دماغ میں آتا ہے، اس کو مصنف سے منسوب کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

اور مصنف غریب کس شمار قطار میں ہیں۔ اپنے ادبی قیاس و قیافے کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن یہاں تک ڈینگ مارنے لگے کہ میں آدمی کی چال سے بٹا سکتا ہوں کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ اتفاق سے اُس وقت ایک بھڑے بھڑے پچھلے والی لڑکی دکان کے سامنے سے گزری۔ چینی قمیض اُس کے بدن پر حُشیت فقرے کی طرح کسی ہوتی تھی سر پر ایک ربن سلیقے سے اوڑھے ہوئے، جسے میں ہی کیا، کوئی بھی شریف آدمی، دوپٹہ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ دوپٹہ کبھی اتنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ تنگ موری اور تنگ تر گھیر کی شلوار۔ چال اگرچہ کڑی کمان کا تیر نہ تھی، لیکن کہیں زیادہ مہلک۔ کمان کتنی بھی اُترتی ہوئی کیوں نہ ہو، تیر لا محالہ سیدھا ہی آئے گا۔ ٹھک ٹھک کر نہیں، لیکن وہ قتالہ عالم قدم آگے بڑھانے سے پہلے ایک دفعہ جسم کے درمیانی حصے کو گھنٹے کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں یوں ہلاتی کہ بس چھری سی چل جاتی۔ نتیجہ یہ کہ متذکرہ حصہ جسم نے جتنی مسافت جنوب سے شمال تک طے کی، اتنی ہی مشرق سے مغرب تک۔ مختصر یوں سمجھیے کہ ہر کام پر ایک قدِ آدم صلیب (+) بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

”اچھا، باؤ، اس کی چوٹھی چال سے کیا ٹپکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی چال سے تو بس اس کا چال چلن ٹپکے ہے“ مجھے آنکھ مار کر کہہ سکتے

ہوتے بولے۔

”پھر وہی بات! چال سے باؤ، کیسی کتابیں پڑھتی ہے؟“ میں نے بھی پچھا

نہیں چھوڑا۔



”پگلے! یہ تو خود ایک کتاب ہے!“ انھوں نے شہادت کی انگلی سے سرک پر اُن خواندگان کی طرف اشارہ کیا جو ایک فرلانگ سے اس کے پیچھے پیچھے فہرست مضامین کا مطالعہ کرتے چلے آ رہے تھے۔

دیکھا گیا ہے کہ وہی کتب فروش کامیاب ہوتے ہیں جو کتاب کے نام اور قیمت کے علاوہ اور کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی ناواقفیت عامہ جس قدر وسیع ہوگی جس قدر عمیق اور متنوع ہوگی، اتنی ہی بھرپور خود اعتمادی اور معصوم گمراہی کے ساتھ وہ بُری کتاب کو اچھا کر کے بیچ سکیں گے۔ اس کے برعکس کتابیں پڑھتے پڑھتے (ادھوری ہی سہی) ہمارے ہیر و کو اسلامی نادلوں کے جوشیلے مکالمے حفظ ہو گئے تھے اور بغدادی جہم خانے میں کبھی ویسی دہسکی کی زیادتی سے موصوف پر ہندیانی کیفیت طاری ہو جاتی تو دشمنِ اسلام پر گھونسنے تان تان کر ترطاق پڑاق ایسے ڈائیلاگ بولتے جن سے شوقِ شہادت، اس طرح ٹپکا پڑتا تھا کہ بیرون تک کا ایمان تازہ ہو جاتا۔

مسلل ورق گردانی کے سبب نئی نویلی کتابیں اپنی کنواری کمراری مہک اور جلد کی کسادٹ کھوچکی تھیں۔ بیشتر صفحات کے کونے کٹے کے کانوں کی طرح مڑ گئے تھے اور بعض پسندیدہ اوراق کی یہ کیفیت تھی کہ

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

اور لشکر بھی وہ جو خون کی بجائے پیک کی چھینٹیں اڑاتا ہوا گزر جائے! ایک مرتبہ اُن کو بھری دکان میں اپنے ہی سائز کے ایک اسلامی ناول کا عطر نکالتے دیکھا تو مرزا نے ٹوکا۔۔۔۔۔ ”لوگ اگر کسی سلوائی کو مٹھائی چکے دیکھ لیں تو اس سے مٹھائی خریدنی چھوڑ دیتے ہیں اور ایک تم ہو کہ ہر آئے گئے کے سامنے کتب چینی کرتے رہتے ہو!“



پھر کیا تھا، پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ پھٹ پڑے ”کتب فروشی ایک علم ہے،  
 بخود فار! ہمارے ہاں نیم جاہل کتابیں لکھ سکتے ہیں، مگر بیچنے کے لیے باخبر ہونا ضروری ہے۔  
 بعینہ اسی طرح جیسے ایک اندھا سُرہ بنا سکتا ہے مگر بیچ بازار میں کھڑے ہو کر بیچ نہیں  
 سکتا۔ میاں! تم کیا جانو، کیسے کیسے جتید جاہل سے پالا پڑتا ہے۔ (اپنی عزیز ترین کتاب کی  
 جانب اشارہ کرتے ہوئے) جی میں آتی ہے، دیوان غالب (مع مقدمہ مولانا امتیاز علی  
 عرشی) ان کے سر پر دے ماروں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ دو ہفتے ہونے کو آتے ہیں۔ ایک  
 منظر صُورت کلرک یہاں آیا اور مجھے اس کونے میں لے جا کر کچھ شرماتے، کچھ لجاتے ہوئے  
 کہنے لگا کہ کرشن چندر ایم اے کی وہ کتاب چاہیے جس میں ”تیری ماں کے دودھ میں حکم کا  
 اٹکا“ والی گالی ہے۔ خیر! اسے جانے دو کہ اس بچارے کو دیکھ کر واقعی محسوس ہوتا تھا کہ  
 یہ گالی سامنے رکھ کر ہی اس کی صورت بنائی گئی ہے۔ مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو  
 نئے نئے اردو کے لیکچرر مقرر ہوتے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اسی مہینے کی پہلی تاریخ  
 کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کر کے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ  
 لگے پوچھنے، صاحب! آپ کے ہاں غٹو کی وہ کتاب بھی ہے جس میں ”دھرن تختہ“ کے معنی  
 ہوں؟ اور ابھی پرسوں کا ذکر ہے۔ ایک محترمہ تشریف لائیں۔ سن یہی اٹھارہ انیس کا۔  
 نکلتا ہوا فریبہ بدن۔ اپنی گڑیا کی چولی پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کی رِحل بنا کر  
 پر اپنا کتابی چہرہ رکھا اور لگیں کتابوں کو مگر مگر دیکھنے۔ اسی جگہ جہاں تم کھڑے ہو۔ پھر  
 دریافت کیا، کوئی ناول ہے؟ میں نے راتوں کی نیند حرام کرنے والا ایک ناول پیش کیا  
 رِحل پر سے اُلیس، یہ نہیں، کوئی ایسا دلچسپ ناول دیجیے کہ رات کو پڑھتے ہی نیند آجائے۔  
 میں نے ایک ایسا ہی غشی آور ناول نکال کر دیا۔ مگر وہ بھی نہیں چچا۔ دراصل انھیں کسی



گہرے سبز گرد پوش والی کتاب کی تلاش تھی، جو ان کی خواب گاہ کے سرخ پردوں سے ”میچ“ ہو جائے۔ اس سخت معیار پر صرف ایک کتاب پوری اُترتی۔ وہ تھی ”اُستاد موٹر ڈرائیوری“ (منظوم) جس کو دراصل اردو زبان میں خود کشی کی آسان ترکیبوں کا پہلا منظوم ہدایت نامہ کہنا چاہیے۔ میں نے نوخیز خاتون کی حمایت کی ”ہمارے ہاں اردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں جو بغیر گرد پوش کے بھی اچھی لگیں۔ گرد پوش تو ایسا ہی ہے جیسے عورت کے لیے کپڑے۔“ مگر ہالی وڈ میں آج کل زیادہ تر ایکٹریں ایسی ہیں جو اگر کپڑے پہن لیں تو ذرا بھی اچھی نہ لگیں۔“ مرزا نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

لیکن نیا نیا شوق تھا اور ابھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ ایسے واعیات سے ان کی طبیعت سچ مچ مُکدّر ہو جائے۔ ڈیل کاریگی کے مشورے کے مطابق وہ ہر وقت مُسکراتے رہتے اور ہم نے سوتے میں بھی ان کی باچھیں بطور خیر سگالی کھلی ہوتی ہی دیکھیں۔ اس زمانے میں بقول مرزا، وہ چھوٹا دیکھتے نہ بڑا ہر کس و ناکس کے ساتھ ڈیل کاریگی کیا کرتے تھے۔ حد یہ کہ ڈاکیا اگر بیزنگ خط بھی لاتا تو انعام و اکرام دے کر رخصت کرتے۔ گاہکوں کو تو ذاتی مہمان سمجھ کر بچہ بچہ جاتے اور اکثر متاعِ سخن کے ساتھ (اور کبھی اس کے بغیر ہی) خود بھی بک جاتے۔ سچ ہے خوش خلقی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں دکان چل نکلی، مگر دکانداری ٹھپ ہو گئی۔ یہ صورتِ تضاد اس طرح پیدا ہوئی کہ دکان پر اب ان قدردانوں کی ریل پیل رہنے لگی، جو اصل میں ان سے کوکا کو لاپنیے یا فون کرنے آتے اور رُکن میں ایک آدھ کتاب عاریتہ لے کر ٹلتے۔ جس گاہک سے خصوصیت برتتے، اس کی پیشوائی کو بے تحاشہ دوڑتے ہوئے سڑک کے اس پار جاتے۔ پھر اسے اپنے اُونچے سے اسٹول پر بٹھا کر فوراً دوسرے گاہک کو چالیں قدم تک رخصت کرنے چلے جاتے۔ ہر دو







چلے آئے تھے کہ وہ کل کا کام آج ہی کر ڈالنے کے قائل ہیں۔ پھر یہ کہ قرض پر کتابیں بیچنے پر ہی اکتفا کرتے تو صبر آجانا۔ لیکن آخر آخر میں یہاں تک سننے میں آیا کہ بعض گاہک ان سے نقد روپے قرض لے کر پاس والی دکان سے کتابیں خریدنے لگے ہیں۔

میں موقع کی تلاش میں تھا، لہذا ایک دن تخلیہ پا کر انھیں سمجھایا کہ بندہ خدا! اگر قرض ہی دینا ہے تو بڑی رستم قرض دو تا کہ لینے والے کو یاد رہے اور تمہیں تقاضا کرنے میں شرم نہ آئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قرضے دے کر خلق خدا کے ایمان اور اپنے اخلاق کی آزمائش کا سہ کو کرتے ہو؟ میری بات ان کے دل کو لگی۔ دوسرے ہی دن خزانچی جی سے نادہند خریداروں کی مکمل فہرست حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کرائی اور پھر خود اسی ترتیب سے ادھار وصول کرنے کا بیج روزہ منصوبہ بنا ڈالا، لیکن الف ہی کی رویت میں ایک ایسا ناہنجار آن پڑا کہ چھ مہینے تک 'ب' سے شروع ہونے والے ناموں کی باری نہیں آئی۔ میں نے یہ نقشہ دیکھا تو پھر سمجھایا کہ جب یہ حضرات تمہارے پاس حروفِ تہجی کی ترتیب سے قرض لینے نہیں آتے تو تم اس ترتیب سے وصول کرنے پر کیوں اڑے ہوئے ہو؟ سیدھی سی بات تھی مگر وہ منطق پر اتر آئے۔ کہنے لگے، اگر دوسرے بے اصول ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی بے اصولا ہو جاؤں۔ دیکھتے نہیں، اسکول میں حاضری کے وقت بچوں کے نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے پکارے جاتے ہیں، مگر بچوں کو اسی ترتیب سے پیدا یا پاس ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بولتے کیوں نہیں؟

اس کے باوجود میری نصیحت کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اب کتاب ادھار نہیں بیچتے تھے، تحفہ دے دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جب رقم ڈوبنی ہی ہے تو پھر ثواب سے بھی کیوں محروم رہوں؟ ادھر کچھ عرصے سے انھوں نے بھی کھلتے لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا جس کا یہ معقول



جواز پیش کرتے کہ میں نقصانِ مایہ میں جان کے زیاں کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ مرزا نے یہ لٹس محبتی دیکھی تو ایک دن پوچھا:

”آج کل تم حکومت کے فرائض کیوں انجام دے رہے ہو؟“  
 ”کیا مطلب؟“

”تم نے قوم کی مفت تعلیم کا ذمہ کیوں لے رکھا ہے؟“

اب اُن کے چہرے پر دانائی کی وہ چھوٹ پڑنے لگی جو عموماً دوالہ شکنے کے بعد طلوع ہوتی ہے۔ مرزا کا خیال ہے کہ جب تک دو تین دفعہ دوالہ نہ نکلے، آدمی کو دکانِ اری کا سلیقہ نہیں آتا۔ چنانچہ اس مبارک بربادی کے بعد وہ مجھ سے گئے اور ہر شے میں اپنی کمی محسوس کرنے لگے۔ وہ دائمی (BUILT-IN) منسکراہٹ بھی غائب ہو گئی اور اب وہ بھول کر کسی گاہک سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ مبادا وہ ادھار مانگ بیٹھے۔ اکثر دیکھا کہ جمل ہی گاہک نے دکان میں قدم رکھا اور انھوں نے گھرک کر پوچھا ”کیا چاہیے؟“ ایک دن میں نے دُڑ بڑایا ”اندھے کو بھی نظر آتا ہے کہ کتابوں کی دکان ہے۔ پھر تم کیوں پوچھتے ہو، کیا چاہیے؟ کیا چاہیے؟“ فرمایا ”کیا کروں“ بعض نے بعض کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ یہ پوچھنا پڑتا ہے۔

کتابیں رکھنے کے گناہگار ضرور تھے۔ طوعاً و کرہاً بیچ بھی لیتے تھے۔

لیکن عیارِ طبعِ حسریدار دیکھ کر

ان کے نک چڑھے پن کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص پوچھتا ہوا آیا ”لُغت ہے؟“ ”لُغت“ کا تلفظ اس نے ”لُطف“ کے وزن پر کیا۔ انھوں نے نتھنہ پھلا کر جواب دیا ”اسٹاک میں نہیں ہے۔“ وہ چلا گیا تو میں نے کہا ”یہ سامنے رکھی



تو ہے تم نے انکار کیوں کر دیا؟“ کہنے لگے ”یہ تو لغت ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس بچارے کا کام ایک لغت سے تھوڑا ہی چلے گا!“ ہاں تلفظ پر یاد آیا کہ اس دورِ ابتلا میں انھوں نے دکان میں ایک ازکار رفتہ ریڈیو رکھ لیا تھا۔ اسی کو گود میں لیے گھنٹوں گڑ گڑا ہٹ سنا کرتے تھے، جسے وہ مختلف ملکوں کے موسم کا حال کہا کرتے تھے۔ بعد میں مرزا کی زبانی غایتِ سمیع خراشی یہ معلوم ہوئی کہ اس ریڈیائی دے کی بدولت کم از کم گاہکوں کی غلط اُردو تو سنائی نہیں دیتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کتب فروشوں کو ہر کتاب پر اوسطاً تیس چالیس فی صد کمیشن ملتا ہے۔ بلا کہ و کاوش۔ جس پیشے میں منافع کی یہ شرح عام ہو، اس میں دولت نکالنے کے لیے غیر معمولی دل و دماغ درکار ہیں۔ اور وہ ایسے ہی دل و دماغ کے مالک نکلتے اپنی حسابی صلاحیتوں کا دستاویزی ثبوت وہ اس زمانے ہی میں دے چکے تھے، جب سہ ماہی امتحان کی کاپی میں وہ اپنا نام شیخ صبغت اللہ لکھتے اور غیر سرکاری طور پر محض ”صبغے“ کہلاتے تھے۔ اسی زمانے سے وہ اپنے اس عقیدے پر سختی سے قائم ہیں کہ علم الحساب درحقیقت کسی معتصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ ایک دن یہ خبر سُن کر بڑی حیرت ہوئی کہ رات ان پر علم الحساب ہی کے کسی قاعدے کی رُو سے یہ منکشف ہوا ہے کہ اگر وہ کتابیں نہ بیچیں (دکان ہی میں پڑی سڑنے دیں) تو توڑے فی صد منافع ہوگا۔ منافع کی یہ اندھا دھند شرح سُن کر مرزا کے بھی منہ میں پانی بھر آیا۔ لہذا نزدیک ترین گلی سے صبغے کے پاس وہ گھر معلوم کرنے پہنچے، جس کی مدد سے وہ بھی اپنی پرانے کوٹوں کی دکان میں تالہ ٹھوک کر فی الفور اپنے دلدر و در کر لیں۔

صبغے نے کان میں لگی ہوئی فیسل کی مدد سے اپنے فارمولے کی جو تشریح کی اُس



کاپ لباب سلیس اردو میں یہ ہے کہ اب تک ان کا یہ معمول رہا کہ جس دن نئی کتا ہیں خرید کر دکان میں لگاتے، اسی دن اُن پر طے والے چالیس فی صد منافع کا حساب (قریب ترین پائی تک) لگا کر خرچ کر ڈالتے۔ لیکن جب یہ کتابیں سال بھر تک دکان میں پڑی بھٹکتی رہتیں تو ”کرمس سیل“ میں ان گنج ہائے گراں مایہ کو بچاس فی صد رعایت پر فروخت کر ڈالتے اور اس طرح اپنے حساب کی رو سے ہر کتاب پر نوے فی صد ناجائز نقصان اٹھاتے۔ لیکن نیا فارمولا دریافت ہونے کے بعد اب وہ کتابیں کیسر فروخت ہی نہیں کریں گے، لہذا اپنی اس حکمت بے عملی سے نوے فی صد نقصان سے صاف بچ جائیں گے اور یہ منافع نہیں تو اور کیلے؟

کتب فروشی کے آخری دور میں جب ان پر سمیری وقت پڑا تو ہر ایک گاہک کو اپنا مالی دشمن تصور کرتے اور دکان سے اس کے خالی ہاتھ جانے کو اپنے حق میں باعث خیر و برکت گردانتے۔ ہفتے کو میرا دفتر ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔ واپسی میں یوں ہی خیا آیا کہ چلو آج صحنے کی دکان میں جھانکتا چلوں۔ دیکھا کہ وہ اونچے اسٹول پر پیر لٹکائے اپنے قرضداروں کی فہرستوں سے ٹیک لگاتے سو رہے ہیں۔ میں نے کھنکار کر کہا:

”قیلولہ —؟“

”اشاک میں نہیں ہے!“ آنکھیں بند کیے کیے بولے۔

یہ کہہ کر فوراً گردن اٹھائی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اپنی داہنی ہتھیلی دیکھی اور پھر سو گئے۔

داہنی ہتھیلی دیکھنا ان کی بڑی پرانی عادت ہے جسے زمانہ طالب علمی کی یادگار کہنا چاہیے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن بھر خوار و خستہ ہونے کے بعد وہ رات کو ہوٹل میں کسی نہ



کسی کے سر ہو جلتے کہ صبح تمہارا منہ دیکھتا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے کے ساتھی اپنی بدنامی کے خوف سے صبح دس بجے تک لحاف اوڑھے پڑے رہتے اور کھوپے کی طرح گردن نکال نکال کر دیکھتے رہتے کہ صبحے دفعتاً مڑے یا نہیں۔ جب اپنے بیگلے سب آتے دن کی خوشیوں کی ذمہ داری لینے سے یوں منہ چھپانے لگے تو صبح نے ایک ہندو نجومی کے مشورے سے یہ عادت ڈالی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی شکون کے لیے اپنی دائیں ہتھیلی دیکھتے اور دن بھر اپنے آپ پر محنت بھیجتے رہتے۔ پھر تو یہ عادت سی ہو گئی کہ نازک و فیصلہ کن لمحات میں مثلاً اخبار میں اپنا رول نمبر تلاش کرتے وقت آتش پھینکنے کے بعد اور کرکٹ کی گیند پر ہٹ لگانے سے پہلے ایک دفعہ اپنی دائیں ہتھیلی ضرور دیکھ لیتے تھے جس زمانے کا یہ ذکر ہے ان دنوں ان کو اپنی ہتھیلی میں ایک حسینہ صاف نظر آ رہی تھی جس کا جہیز بشکل ان کی ہتھیلی میں سما سکتا تھا۔

الادریوں کے ان گنت خانے جو کبھی ٹھساٹھس بھرے رہتے تھے اب خالی ہو چکے تھے۔ جیسے کسی نے بھٹکے والے نکال لیے ہوں۔ مگر صبحے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ اکثر دیکھا کہ ظہر سے عصر تک شیشے کے شوکیں کی فرضی ادٹ میں اپنے خلیفے چمیرے بھائیوں کے ساتھ سر جوڑے فلس کھیلتے رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ جوا اگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کھیلا جائے تو کم گناہ ہو رہا ہے۔ رہی دکان داری تو وہ ان حالات کو پہنچ گئی تھی کہ تاش کے پتوں کے سوا اب دکان میں کاغذ کی کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ گاہکوں کی تعداد اگرچہ گنی چو گنی ہو گئی، مگر مول تول کی نوعیت قدرے مختلف ہوتے ہوئے جب یہ نوبت آئی کہ راہ چلنے والے بھی بھاؤ آؤ کرنے لگے تو خزانچی جی نے خالی گتے پر ایک نوٹس نہایت پاکیزہ خط میں آویزاں کر دیا :



”یہ فریخہ کی دکان نہیں ہے“

یاد رہے کہ ان کی نصف زندگی ان لوگوں نے تلخ کر دی جو قرض پر کتابیں نے جانے تھے اور بقیہ نصف زندگی ان حضرات نے تلخ کر رکھی تھی جن سے وہ خود قرض لیے بیٹھے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تباہی میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا۔ قدرت نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا جس دیا تھا کہ سونے کو ہاتھ لگائیں تو مٹی ہو جائے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی بربادی کا سہرا قدرت کے علاوہ ان مہربانوں کے سر تھا جو انتہائی خلوص و مستقل مزاجی کے ساتھ دے دے، قدمے، سخنے ان کو نقصان پہنچاتے رہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکا ہوں یہ تھی کہ وہ اپنے خاص دوستوں سے اپنی حاجت اور ان کی حیثیت کے مطابق قرضہ لیتے رہے اور قرضے کو منافع سمجھ کر کھا گئے۔ بقول مرزا ان کا دل بڑا تھا اور قرض لینے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ قرض پر لین دین ان کے مزاج میں اس حد تک رچ بس چکا تھا کہ مرزا کا خیال تھا کہ صیغے دراصل سہروردی حکومت کو کھکھ کرنے کی غرض سے اپنی آمدنی نہیں بڑھاتے۔ اس لیے کہ آمدنی بڑھے گی تو لا محالہ انکم ٹیکس بھی بڑھے گا۔ اب تو ان کی یہ تمنا ہے کہ بقیہ عمر عزیز ”بنک اور ڈرافٹ“ پر گوشہ بدنامی میں گزار دیا۔ لیکن ان کی نیت بُری نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے ان کی نیک نیتی کو ابھرنے نہ دیا۔ گزشتہ رمضان میں ملاقات ہوئی تو بہت اداس اور فکر مند پایا۔ بار بار پتلون کی جیب سے یدِ بھینا نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پوچھا، صیغے! کیا بات ہے؟ بولے، کچھ نہیں۔ پروفیسر عبدالقدوس سے قرض لیے تیرہ سال ہونے کو آئے۔ آج یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا ادب واپسی کی سبیل کرنی چاہیے ورنہ وہ بھی دل میں سوچیں گے کہ شاید میں ناہند ہوں۔

عوانی میں خدا کے قائل نہیں تھے، مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، ایمان سُجھتا ہوتا گیا



یہاں تک کہ اب وہ اپنی تمام مالا فقیوں کو سچے دل سے من جانب اللہ سمجھنے لگے تھے طبیعت ہی ایسی پانی تھی کہ جب تک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بڑی سے بڑی قربانی نہ دے دیتے، انھیں چین نہیں پڑتا تھا۔ بقول مرزا، وہ انا الحق کے بغیر سولی پر چڑھنا چاہتے تھے۔ تجارت کو انھوں نے وسیلہ معاش نہیں حیلہ جہاد سمجھا اور بہت جلد شہادت کا درجہ پایا۔

دکان کی دیوار کا پلاسٹر ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ اس مقام پر (جو تقریباً دو مربع گز تھا) انھوں نے ایک سرخ تختی، جس پر ان کا فلسفہ حیات بحظ نستعلیق کندہ تھا، ٹانگ دی ۵

باطل سے رہنے والے اے آسمان نہیں ہم

اس میں قطعی کوئی تعلق نہیں تھی، بلکہ دیکھا جائے تو انھوں نے کسر نفسی سی سے کام لیا کیونکہ باطل تو باطل وہ حق سے بھی رہنے والے نہیں تھے! مرزا اکثر نصیحت کرتے کہ میاں! کامیابی چاہتے ہو تو کامیاب کتب فروشوں کی طرح بقدر ضرورت سچ بولو اور ہر کتاب کے حسن و قبح پر ختم نہ آکر نئے سکے بجاتے گا کہوں کو انہی کی پسند کی کتابوں سے برباد ہونے دو جو بچارا تروڑ سے لے جاتے تھے زبردستی انگریز کیوں کھلاتے ہو؟ لیکن عینے کا کہنا تھا کہ بیسویں صدی میں یہ سب انہی کی ہے جن کے ایک ہاتھ میں دین ہے اور دوسرے میں دنیا۔ اور وائیں ہاتھ کو خیر نہیں کہ باتیں میں کیا ہے! تجارت اور نجابت میں سنجوگ ممکن نہیں۔ تجارت میں فوری ناکامی ان کے نزدیک مقیاس شرافت تھی۔ انہی کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت میں بہت جلد ناکام نہ ہو سکے تو سمجھ لو کہ اس کے حسب نسب میں فی ہے۔ اس اعتبار سے انھوں نے قدم قدم پر بلکہ ہر سودے میں اپنی نسب شرافت کا وافر ثبوت دیا۔ سناں آدمی تھے۔ اس پر بد قسمتی یہ کہ ایک ناکام کتب فروش کی حیثیت سے انھیں



انسانوں کی فطرت کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اسی لیے بہت جلد انسانیت سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے تمام عمر تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھائیں۔ شاید اسی وجہ سے انھیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ زندگی سے کب کے بیزار ہو چکے تھے اور ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا گویا اب محسن اپنے قرض خواہوں کی تالیفِ قلوب کے لیے جی رہے ہیں۔ اب ہم ذیل میں وہ تاثرات و تعصبات مختصر بیان کرتے ہیں جو ان کی چالیس سالہ نا تجربہ کاری کا پھر ہیں۔

دکان کھولنے سے چار پانچ مہینے پہلے ایک ادبی خیر سگالی وفد (ادارہ برائے ترقی انجمن پسند مصنفین) کے ساتھ سیلون ہو آئے تھے جسے حاسد لنکا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس جزیرے کی سہ روزہ سیاحت کے بعد اٹھتے بیٹھتے ”ترقی یافتہ ممالک“ کی ادب نوازی و علم دوستی کے چرچے رہنے لگے۔ ایک دفعہ برادرانِ وطن کی نا قدری کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا ”آپ کے ہاں تو ابھی تک جہالت کی خرابیاں دور کرنے پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک میں تو اب مارا مارا ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں جن کا مقصد ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو محض جہالت دور ہونے سے پیدا ہو گئی ہیں صاحب! وہاں علم کی ایسی قدر ہے کہ کتاب لکھنا، کتاب چھاپنا، کتاب بیچنا، کتاب خریدنا مسجد یہ کہ کتاب چرانا بھی ثواب میں داخل ہے۔ یقین مانئے ترقی یافتہ ممالک میں تم جاہل آدمی ٹھیک سے مجرم بھی نہیں کر سکتا۔ شامتِ اعمال میرے منہ سے نکل گیا، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کوئی کتاب اس وقت تک اچھی خیال نہیں کی جاتی، جب تک کہ اس کی فلم نہ بن جائے اور فلم بننے کے بعد کتاب پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ انھیں غصہ آ گیا ”تین پیسے کی چھو مری“ کا ٹونا موڑ کر واپس الماری میں رکھی اور میرے لب و لہجے کی ہوبو نقل اُتارتے ہوئے بولے ”اور آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ نو جوان اس وقت تک اردو کی کوئی کتاب پڑھنے کی حاجت محسوس



نہیں کرتے، جب تک پولیس اسے فحش قرار نہ دے دے اور فحش قرار پانے کے بعد اس کے بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے طنز میں طعنے کا رنگ اچلا تھا، اس لیے میں نے جھٹ سے حامی بھر لی کہ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اُردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

میرے بچے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے لٹے بھی سے اُلجھنے لگے کہ آپ بات کی تہ تک نہیں پہنچے۔ آپ دھڑا دھڑ کتابیں چھاپ سکتے ہیں، مگر زبردستی پڑھوانہیں سکتے ہیں نے کہا، کیوں نہیں؟ اٹھا کے نصاب میں داخل کر دیجیے۔ وہ بھلا ہار ملنے والے تھے۔ کہنے لگے، اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیجیے۔

کتب فروشی کی بدولت صبیغے کا مابقہ ایسے ایسے پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں

سے پڑا

ہزاروں سال زر گس جن کی بے نوری پر روتی ہے

ان میں خیام کے وہ دل دادہ بھی شامل تھے جو اصل رباعیوں میں ترجمے کی خوبیاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ان میں وہ سال خور وہ کتاب خواں بھی تھے جو کجالاتے ہوئے کوئلوں کو دہکانے کے لیے بقول مرزا، عرباں نادلوں سے منہ کالا کرتے اور سمجھتے کہ ہم اردو کی عزت بڑھا رہے ہیں۔ (یہ قول انہی کا ہے کہ فحش کتاب میں دیکھ نہیں لگ سکتی کیونکہ دیکھ ایسا کاغذ کھا کر افزائش نسل کے قابل نہیں رہتی۔) ان میں وہ خوش نصیب بھی تھے، جن کے لیے کتاب بہترین رفیق ہے اور وہ کم نصیب بھی جن کے لیے واحد رفیق!

اور اس بے نام قبیلے میں وہ بدست پسند پڑھنے والے بھی شامل تھے جو ہر لمحہ



”تازہ بہ تازہ“ نوبہ نو کے طلب گار تھے۔ حالانکہ ان جیسوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقط ڈکشنری ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے وہ جب بھی دیکھیں، انشاء اللہ نئی معلوم ہوگی۔ لیکن ایک حد تک صبغہ کی بھی زیادتی تھی کہ نئی اردو کتابوں کو اپنے دل اور دکان میں جگہ دینا تو بڑی بات ہے، چمٹے سے پکڑ کر بھی بیچنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک دن خاقانی ہند استاد ذوق کے قصائد کی گرو ہفتہ وار ٹائم سے جھاڑتے ہوئے کلکٹا کر کہنے لگے کہ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب ایک ”کیپ سول“ میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے، جسے وہ کوکا کو لاکے گھونٹ کے ساتھ غٹک سے حلق سے اُتار لیں۔ انسانی تہذیب پتھر اور بھوج پتر کے عہد سے گزرا کر اب ریڈرز ڈائی جسٹ کے دور تک آگئی ہے۔ سمجھے؟ یہ مصنفوں کا دور نہیں، صحافیوں کا دور ہے! صحافیوں کا!

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”مگر صحافت میں کیا قباحت ہے؟“  
 بولے ”کچھ نہیں۔ بڑا مصنف اپنی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے، مگر بڑا صحافی پبلک کی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے!“

مصنفوں کا ذکر چھڑ گیا تو ایک واردات اور سنتے چلیے۔ سات آٹھ مہینے تک وہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ بیچتے رہے، جس کے سرورق پر مصنف کے دستخط بقلم خود ثبت تھے اور اوپر یہ عبارت: ”جس کتاب پر مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ جعلی تصور کی جائے۔“ ایک روز انھیں رجسٹری سے مصنف کے وکیل کی معرفت نوٹس ملا کہ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہمارے موکل کی کتاب کا ایک مصدقہ ایڈیشن عرصہ آٹھ ماہ سے مبینہ طور پر فروخت کر رہے ہیں، جس پر مصنف مذکور کے دستخط بقید تاریخ ثبت ہیں۔ آپ کو بذریعہ نوٹس انہما مطلع و متنبہ کیا جاتا ہے کہ محکمہ بالا کتاب اور دستخط دونوں سراسر جعلی ہیں۔



اصل ایڈیشن میں مصنف کے دستخط سرے سے ہیں ہی نہیں۔ اس واقعے سے انھوں نے ایسی عبرت پکڑ لی کہ آئندہ کوئی ایسی کتاب دکان میں نہیں رکھتی، جس پر کسی کے بھی دستخط ہوں۔ بلکہ جہاں تک بن پڑتا، انہی کتابوں کو ترجیح دیتے، جن پر مصنف کا نام تک درج نہیں ہوتا۔ مثلاً الف لیلی، نابطلہ فوجداری، ریلوے ٹائم ٹیبل، انجیل۔

تبہا ہی کی جو طبعزاد راہ بلکہ شاہراہ انھوں نے اپنے لیے نکالی، اس پر وہ تو کیا، قارون بھی زیادہ دیر کا مزن نہیں رہ سکتا تھا، کیونکہ منزل بہت دور نہیں تھی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا، جس کا دشمنوں کو انتظار تھا اور دوستوں کو اندیشہ۔ دکان بند ہو گئی۔ خزانچی جی کی تنخواہ ڈھائی مہینے سے چڑھی ہوئی تھی۔ لہذا خالی الماریاں، ایک عدد گولک چوبی جو ناو ہندو کی فرستوں سے منہ تک بھری تھی۔ چاندی کا خوبصورت سگرٹ کیس جسے کھولتے ہی محسوس ہوتا تھا گویا بیڑی کا بندل کھل گیا۔ نیسینی جس کی صرف اوپر کی تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں، خواب آور گولیوں کی شیشی، کراچی ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کے شجرہ ہائے نسب، نومبر سے دسمبر تک کا مکمل کیلنڈر کیل سمیت۔ یہ سب خزانچی جی نے صبح کی اولین غفلت میں، ہتھیلیاں اور راتوں رات اپنی تنخواہ کی ایک ایک پاتی گدھا گاڑی میں ڈھونڈھو کر لے گئے۔ دوسرے دن دکان کا مالک بقایا کراتے کی مدد میں جو جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ اٹھا کر یا اکھاڑ کر لے گیا، اُس کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہمارے پڑھنے والوں کو میں اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ ان میں سب سے قیمتی چیز بغیر چابی کے بند ہونے والا ایک قفل فولادی ساختہ جرمنی تھا۔ پرانا ضرور تھا، مگر ایک خوبی اس میں ایسی پیدا ہو گئی تھی جو ہم نے سنے سننے جرمن تانوں میں بھی نہیں دیکھی۔ یعنی بغیر چابی کے بند ہونا اور اسی طرح کھلنا!



صبحیہ غریب کے حصے میں صرف اپنے نام (مع فرضی فرزند ان) کا سائن بورڈ آیا جس کو سات روپے مزدوری دے کر گھر اٹھوا لائے اور دوسرے دن سواریے میں محلے کے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ مگر انھوں نے سہمت نہیں ہاری اور دو مہینے تک اپنی ہتھیلی کا شبانہ روز مطالعہ کرنے کے بعد ایک ٹرننگ کالج میں اسکول ماسٹروں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ مرزا کے الفاظ میں صبحیہ کی کتب فروشانہ زندگی کے باب کا انجام نہایت افسانوی رہا۔ جس افسانے کی طرف یہاں مرزا کا اشارہ ہے، وہ دراصل کافی لنگ کی ایک مشہور چینی کہانی ہے جس کا ہیرو ایک آرٹسٹ ہے۔ ایک دن وہ اپنی ایک ماڈل لڑکی کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت اپنے سارے برش اور کینوس سمیٹ سماٹ کر جلا ڈالے اور ایک سرکس میں ہاتھیوں کو سدھانے کا کام کرنے لگا۔

جنوری ۱۹۶۲ء



## سیر، ماماہری اور میرزا

”ہائے اللہ! یہ ہاتھی کا ہاتھی کُتا کا ہے کو لے آئے؟“

”چوکیداری کے لیے۔“

”کس کی؟“

”گھر کی۔“

”اس گھر کی؟“

”ہاں! بہت ہی ہوشیار کُتا ہے۔ گھر میں کچھ نہ ہو، تب بھی چوکیداری کر سکتا

ہے۔“

اس ازدواجی مکالمے سے بعد میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تنخواہ ملتے ہی ہم نے گھر گرہستی کا ضروری سامان خرید ڈالا تاکہ کُتا اس کی چوکیداری کر سکے، لیکن والدین کی سمجھ میں آنے والا جو فوری فائدہ ہم نے سِرِ دست بیان کیا، اس سے اپنے معصوم بچوں کو جان بوجھ کر محسوس رکھنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ وہ فائدہ یہ تھا کہ آخر کو یہ ایک انگریز کا کُتا تھا، اور یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں اُن پڑھ سے اُن پڑھ آدمی بھی اپنے کُتے کا نام انگریزی رکھتا ہے اور انگریزی ہی میں اُس سے بات چیت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اشارۃً توجہ دلائی کہ اس کی وجہ سے بچوں کو انگریزی بولنا آجائے گی۔



یہ سنتے ہی بگیم نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر ایسے فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ  
ہمارے ہاتھ سے چھین لی، جیسے لیڈی میکبتھ نے میکبتھ کے ہاتھ سے زنجیر چھینا تھا:

INFIRM OF PURPOSE!  
GIVE ME THE DAGGER...

یادش زنجیر! اس ڈراپ سین سے کوئی بیس سال اُدھر جب آتش جوان بلکہ نوجوان  
تھا، اُس نے نیلی آنکھوں بھری بھری ٹانگوں اور ”بلونڈ“ بالوں والی میم کو باغ میں اپنے جیپی  
سائز کے ”پومرینین“ کتے کو بھیج بھیج کر پیار کرتے دیکھا تھا۔ تھا بھی ظالم اسی قابل۔ گول  
مٹول۔ جھبرا۔ سفید کالا سے بالوں سے سارا جسم اس بُری طرح ڈھکا ہوا تھا کہ جب تک چلنا  
شروع نہ کرے، یہ بٹا ہوا شکل تھا کہ منہ کس طرف ہے۔ ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہر  
چیز جوان تھی۔ ہر چیز حسین تھی۔ ہر چیز یہ ٹوٹ کے پیار آتا تھا۔ کیسے مہکتے دہکتے دن تھے  
وہ بھی۔

مری سانس میں ہے گرمی کم یہ ٹوسی چل رہی ہے  
اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن ان گنہ گار آنکھوں کو زنجیر کے دونوں سروں پر  
حسن نظر آیا اور دل میں یہ پیار بھری حسرت کر وٹیں لینے لگی کہ انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے  
کے بعد کبھی فراغت اور گوشہ چمن نصیب ہوا تو ایک نیلی آنکھوں بھری بھری ٹانگوں اور ”بلونڈ“  
بالوں والا کتا ضرور پالیں گے۔ مگر ایک تو بقول مرزا اعلیٰ نسل کے کتے باوا کے مول ملتے  
ہیں۔ دوسرے اُس زمانے میں مکان انسانی تھا کہ جانور کا تندرست رہنا محال۔ وہ تو  
خدا بھلا کرے سٹرائس۔ کے ڈین (شیخ خیر الدین) ایم۔ اے (آکسن) کا، جو ہماری نش  
شوق کو ہوا دیتے رہے۔ یہ ہمارے دور پرے کے عزیز ہمسائے تھے۔ ان کے پاس



ایک بڑا جید گناہ تھا۔ خالص ”گرے ہاؤنڈ“ جسے وہ پڑوسیوں کا خون پلا پلا کر پال رہے تھے۔  
 دین رسا رکھتا تھا۔ جسم تیتے جیسا اور مزاج بھی ایسا۔ یوں تو بھونکنے کے تمام مستِ اول  
 اصناف میں استادانہ مہارت رکھتا تھا، لیکن چاندنی چھٹکی ہو اور طبیعت حاضر، تو پھر کچھ  
 ایسی ”اورینجل“ طرز اختیار کرتا کہ جتنی مرتبہ بھونکتا، طبیعت کو ہر بار ایک نئی کوفت حاصل ہوتی  
 دیکھا گیا ہے کہ ایسے ویسے شوقیہ بھونکنے والے کتوں کا سانس تو دو چار دفعہ ہی ٹیاؤں ٹیاؤں  
 کرنے میں اکھڑ جاتا ہے۔ مگر یہ گناہ بقول مرزا، اردو میں بھونکتا تھا، یعنی بھونکتا ہی چلا جاتا تھا  
 کہنے والے کہتے تھے کہ مسٹر ایس۔ کے ڈین اپنے بچ کے بزرگوں کو اپنے لائق نہیں سمجھتے۔ مگر  
 اپنے اکیلے کتے کا شجرہ نسب پندرھویں پشت تک فر فر سناتے اور اس کے آبا و اجداد پر  
 اس طرح فخر کرتے، گویا ان کا خالص خون اُن کی ناچیز رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کہتے تھے، نہر  
 سویز کے اس طرف اتنا خالص و خوشخوار گناہ ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ اس کا دادا پسندہ  
 جون ۱۹۴۱ء کو پانڈیچری میں دیسی کتوں سے لڑتا ہوا مارا گیا، چاندنی رات۔ ہو ہو کا عالم۔  
 چور ہے پر گھمان کارن پڑا۔ کتوں کے پشتے لگ گئے تھے۔ محلے میں مشہور تھا کہ مسٹر ڈین کے  
 ہاں کوئی گھبرا یا گھبرا یا فائر برگیڈ کو فون کرنے بھی چلا جائے تو اُسے اپنے مرحوم کتوں کے اہم  
 دکھائے بغیر فون کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ڈرائنگ روم میں مسٹر ڈین کی ایک بڑی سی  
 تصویر بھی ٹنگی تھی، جو انھوں نے اپنے کتے کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیوں کے ساتھ کھڑے  
 ہو کر اور اس کے تمنغے کوٹ پر لگا کر کھنچوائی تھی۔ ہماری دیرینہ حسرت و شفیتگی کے پیش نظر  
 ایک دن تھلیے میں ہمیں اپنے ٹیپ ریکارڈ پر موجود گتے کے والد مرحوم کا بھونکنا سنایا۔ سن کر  
 خود آبدیدہ ہوئے اور ہمیں بھی اُن کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔

گناہ پالنے کی حسرت کا اظہار ہم نے بارہا مرزا کے سامنے کیا، مگر وہ کتے کا نام آتے



ہی کلٹنے کو دڑتے ہیں۔ کہتے ہیں ”ہٹاؤ بھی! واہیات جانور ہے۔ بالکل بے مصرف۔ کتے کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ پطرس اس پر ایک لاجواب مضمون لکھے۔ سو یہ مقصد عرصہ ہوا، پورا ہو چکا اور اب اس نسل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نسل ناپید ہو بھی گئی تو اردو طنز نگاروں سے نام چلتا رہے گا۔ یوں تو سبھی جانوروں کے بارے میں مرزا کی معلومات ظالمانہ حد تک اوصوری ہیں (مثلاً ابھی کل شام تک وہ لومڑی کو گیدڑ کی مادہ سمجھے بیٹھے تھے اور ————— غضب خدا کا ————— بڑے چوینٹے کو عام چوینٹی کا زرا!) مگر کتوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں اور اپنی بات کی پیروی میں ایک سے ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دن کہنے لگے :

”جس گھر میں گتا ہو، اُس گھر میں چور ہی نہیں رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔“

”چور کا داخل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر رحمت کے فرشتوں کو کیا ڈر ہے؟“

”اس لیے کہ گتا ناپاک ہوتا ہے۔“

”مگر کتے کو صاف ستھرا بھی تو رکھا جاسکتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھیے، صبح و شام نہلاتے ہیں۔“

”اُپلے کو اگر صبح و شام صابن سے دھویا جائے تو کیا پاک ہو جائے گا؟“

”مگر سوال یہ ہے کہ گتا ناپاک کیسے ہوا؟“

”کج بختی کوئی تم سے سیکھے۔ اللہ بخشتے، نانی جان کہا کرتی تھیں کہ کتے کے منہ میں سُر کی رال ہوتی ہے۔“

”لیجیے۔ آپ نے ناپاکی کی ایک اچھوتی توجیہ تلاش کر لی۔“

”بھائی میرے! ایک موٹی سی پہچان آج تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ یاد رکھو، ہر



وہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے۔“

”اس لحاظ سے مسلمان ممالک میں بکروں کو اپنی پاکی و طہارت کے سبب، خاصا نقصان پہنچا ہے۔“

”بکنے والے بکا کریں۔ مسلمانوں نے کتے کو ہمیشہ کتا ہی کہا۔ بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا۔“

”بڑے آدمیوں کی ایک ہی رہی۔ آپ نے سنا نہیں کہ نسلا سب کتے ایک زلمے میں بھیڑیے تھے؟ آدمی کی صحبت میں ان کا بھیڑیا پن جاتا رہا۔ مگر خود آدمی...“

”دیکھو، تم پھر لٹریچر پڑھنے لگے۔ علموں بس کریں اور یار!“

اس بارۂ خاص میں مرزا کے نسلی تعصب کی جڑیں ان کے سگ گزیدہ بچپن تک پہنچتی ہیں۔ اس لیے ہم نے خواہ مخواہ ان سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ گستاخنے کی آرزو کو پالتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آگیا، جب ہمارا انگریز افسر بھاری دل اور اس سے زیادہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے وطن کی جانب روانہ ہوا۔ اور روانگی سے قبل اس تعلق خاطر کی بنا پر جو ہم کو اُس سے اور اُس کو اپنے کتے سے تھا، دریافت کیا :

”تم چاہو تو میرا کتا بطور یادگار رکھ سکتے ہو۔ امپورٹڈ اسیشن ہے۔ تیرہ ماہ کا۔ سیرز کہہ کر پکارو تو دم ہلاتا آتا ہے۔“ آپ اندازہ نہیں کر سکتے، اس صلائے خاص میں ایک کمزور دل کے آدمی کے لیے للچا ہٹ کے کیا کیا سامان پوشیدہ تھے۔ اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اس سے بہتر کوئی یادگار نہیں ہو سکتی کہ جب بھی وہ بھونکے گا، افسر کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ اسیشن! کبھی ہم اس کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں! افسر کی ادنیٰ مہربانی سے ہمیں



اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بادل رزا اگر اس وقت ہمارے دم ہوتی تو ایسی ملتی کہ پھر نہ ملتی۔  
 رہی سہی ہچکچاہٹ کو لفظ ”امپورٹ“ نے دور کر دیا۔ اُس زمانے میں ہر وہ  
 شے جو وطن عزیز میں پیدا نہ ہوتی ہو، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر  
 بگڑا ہوا مسلمان رئیس یہ ثابت کرنے پر تیار بیٹھا تھا کہ نہ صرف اس کے گتے کے، بلکہ اُس کے  
 اپنے بزرگ بھی اصلی امپورٹ تھے اور خالی ایک تلوار لے کر ماورائے النہر سے ہندوستان میں  
 وارد ہوئے تھے۔ امپورٹ گتے سماج میں کیا حیثیت رکھتا ہے، اس کا سرسری سا اندازہ ان  
 واقعات سے لگایا جاسکتا ہے جو دو سال پیشتر ہماری نظر سے گزر چکے تھے۔ ہم سے چار گھر  
 دُور میٹر خلیجی بیرسٹر رہتے تھے۔ ان کے والد مرحوم نے چند نایاب گتے ترکے میں چھوڑے  
 تھے (چھوڑنے کو تو چند نایاب کتابیں بھی چھوڑی تھیں، مگر چونکہ وہ بھی گتوں ہی سے متعلق  
 تھیں، اس لیے ہم نے قصداً ذکر نہیں کیا) انہی میں کی ایک دو غلی سی گتیاں تھیں۔ (جس  
 کے متعلق ان کا فخریہ دعویٰ تھا کہ اس کی نانی جوزیفین کے تعلقات راسپوٹن سے رہ چکے  
 تھے، جو ایک امپورٹ ”گریٹ ڈین“ گتا تھا۔ نیز یہ کہ وہ شملہ سول اینڈ ملٹری کینل سے  
 اس وارداتِ کلبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہیں، جو اُن کے سونے کے کمرے میں آج  
 بھی آنکھوں کو نور، دل کو سرور بخشتا ہے۔) نام ماما ہری رکھ چھوڑا تھا۔ کسی زمانے میں اس  
 کے بلبلے کان ہر وقت لٹکے رہتے تھے۔ مگر اُنھوں نے شہر کے بہترین سرجن سے آپریشن  
 کرا کے اسیشن کی طرح کھڑے کرا لیے تھے۔ رنگ ہلکا براؤن جیسے بیٹھی آنچ پر سنکا ہوا  
 توس۔ بیرسٹر صاحب کی اینگلو انڈین بیوی (جو خود بھی بڑی بھری پری عورت تھی اور سلطنت  
 کی طرح دست بدست آئی تھی) اس پر اپنے ہاتھ سے یوڈی کلون چھڑک کر، مگر مچھ کی کھا



کا جڑاؤ کالر پہنائے گھمانے لے جاتی اور اپنے جوتے سے میچ کرنے کے لیے اس پر  
ٹوٹھ برش سے خضاب لگا دیتی۔ کبھی سیاہ، کبھی بولتا ہوا عتابی۔ یہ تو گرمیوں کی شاموں  
کے معمولات میں سے تھا۔ جاڑے میں ماتاہری فرنج برانڈی کے دو چمچے غٹا غٹ پی کر  
ایرانی قالین پر اپنی مالکہ کی طرح اطالوی ریشم کی انگلیا کی تہمت لگاتے سوتے جاگتے پہرا  
دیتی تھی۔ صورتاً بھیڑیا اور سیرۃً بھیڑ۔ ہم بھیڑ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ صبح و شام ولایتی  
بسکٹ اور ڈبے کا گوشت کھاتے رہنے کے باوجود (یا شاید اسی وجہ سے) بقر عید کی رات  
کو محلے کے قصائی کے ساتھ بھاگ گئی اور تین شب بعد مشکاتی لوٹی بھی تو اس طنطنے سے  
کہ ایک درجن رفقتے حیات جلو میں۔ چال جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی — پیچھے  
مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی۔ خوش صحبتی کے گلی گلی چرچے، مگر ذہانت چھو کر نہیں گئی تھی۔ بقول  
مرزا بالکل گدھی تھی۔ انھی سے مروی ہے کہ اکثر بازار کی گتیوں کے پلے آکر چپیر چپیر اس کے  
دودھ کا آخری قطرہ تک پی جاتے اور اپنے بچے دُم ہلاتے یا پلاسٹک کی ہڈیاں چھوڑتے  
رہ جاتے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے چوکیداری کے لیے چنداں بُری نہ تھی کہ اپنی عزت اُتر  
کے علاوہ ہر چیز کی بخوبی حفاظت کر سکتی تھی۔ اس کے یہ لچھن دیکھے تو بیرسٹر صاحب نے  
اُس کی رکھوالی کے لیے ایک چوکیدار رکھا۔ اسی سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے کنبے  
اور گتیا سمیت کار سے مری جانے لگے تو ان کے ناتا جان قبلہ نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا  
کر دیا۔ بس اڑ گئے کہ میں اس ”نجس گتئی“ کے ساتھ کار میں سفر نہیں کر سکتا۔ لہذا بیرسٹر  
صاحب ان کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔ جتنے دن بزرگوار موصوف ہمارے ہاں مہمان رہے  
بعد نمازِ عشاء ہاتھ پھیلا پھیلا کر منفقہ حقیقی سے دُعا مانگتے کہ پروردگار! مال زادی ماتاہری  
سالانہ زچگی میں اپنے کیفِ کردار کو پہنچے۔ گتیا کہیں کی! ہر رنگ، ہر ساز کی گالی ان کی روزمرہ



گفتگو میں جگینے کی طرح جڑی ہوتی۔ دن بھر نماز کی چوکی پر بیٹھے سب کو حسبِ مراتب خور و کلاں گالیاں دیتے رہتے۔ دُعا میں بھی بے ساختہ یہی رنگ رہتا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے دُعا میں سے گالیاں حذف کر دیتے تو ساری تاثیر جاتی رہتی۔ جو دُعا دل سے نہ نکلے کیونکر مستجاب ہو سکتی ہے؟ اوقاتِ دُعا کے علاوہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنے نافرمانوں سے کے امتیازی سلوک کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتے۔ ان کے تمام شکوے شکایتوں کا لبِ لباب بس یہ تھا کہ میرے ساتھ کتے جیسا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا! آخر میں بھی جان دار ہوں۔

امپورٹڈ کتے کی چھیل چھیلی نواسی کی یہ لذیذ حکایت بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ”امپورٹڈ“ نے انگریز افسر کے منہ سے نکلتے ہی ہماری مدافعت کی دیوار کو، جو کبھی بھی بہت بلند اور سُچتہ نہ تھی، یک لخت ڈھا دیا۔ بھلا ایسے صحبت یافتہ کتے روز روز کہاں ملتے ہیں۔ بالآخر شوقِ فضول ہمارے فطری خوف پر غالب آیا اور جہاز کا لنگر اٹھنے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو ایک خوش نصیب کتے کا مالک پایا۔

لیکن ایک بات کے لیے ہم بھی ذہنی بلکہ جسمانی طور پر تیار نہ تھے۔ ”تیرہ ماہ“ کی عمر سن کر ہمارے تصور میں ایک بہت ہی بھولی بھالی صورت ابھری تھی۔ ہم نے سوچا، جیسے تیرہ مہینے کا آدمی کا بچہ بڑا پیارا سا ہوتا ہے۔ تھن متھنا، گبدا سا، غاؤں غاؤں کرتا ہوا۔ ویسا ہی یہ بھی ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ بچہ کسی کا بھی ہو، بڑا سوٹ لگتا ہے۔ پھر یہ تو اسیشن کا بچہ ٹھیرا۔ جی ہاں بچہ! دراصل ہم اس کے ”امپورٹڈ“ ہونے سے اس قدر مرعوب تھے کہ پلا کہتے ہوئے خود شرم سی محسوس ہوتی تھی۔

مگر سیزر ہر اعتبار سے ہماری توقعات سے بڑھ کر نکلا۔ اس کا سراپا کھینچ کر ہم



ناظرین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے ڈیل ڈول کا سرسری سا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے دیرینہ کرم فرما پر وفیسر قاضی عبدالقدوس کی سالمہ ران اُس کے منہ میں آجاتی تھی۔

اور یہ پروفیسر مذکورہ نے بتایا کہ بندہ خدا! تم نے بھی بڑا غضب کیا! تیرہ مہینے کا اسیشن تو پورا پاٹھا کتا ہوتا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تین مہینے سے زیادہ کا اسیشن نہیں لینا چاہیے۔ اس پر مرزا نے یہ نمک چھڑکا کہ آنکھوں دیکھی بات ہے، کتے کی تندرستی اور نسل اگر مالک سے بہتر ہو تو وہ آنکھیں ملا کر ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ پھر یہ تو غیر معمولی طور پر خوشخوار بھی نظر آتا ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ بولے جو شخص کتے سے بھی نہ ڈرے مجھے اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ ہم نے کہا مرزا! کتا اگر خوشخوار نہ ہو تو پالنے سے فائدہ؟ پھر آدمی بکری کیوں نہ پال لے۔ بولے، ہاں! بکری کتے سے بدرجہا بہتر ہے۔ بڑی بات یہ کہ جب چاہو، کاٹ کر کھا جاؤ۔

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی

دل کو بھاتی ہے بات بکری کی

بحثا بحثی میں ہم دونوں پٹری سے اتر گئے تھے۔ لہذا پروفیسر قاضی

عبدالقدوس نے بحیثیت ثالث بالآخر بیچ میں پڑ کے اس معتدل راتے پر بحث ختم کی کہ کتے میں سے اگر جبراً نکال دیا جائے تو خاصا معقول اور منحصر جانور ہے۔

قاضی عبدالقدوس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ بڑا کتا بڑی مشکل سے سدھایا جاتا

ہے۔ پھر نیا گھر، نئے پہرے، نئی بوباس۔ نتیجہ یہ کہ پہلی رات خود سویا نہ دوسروں کو سونے

دیا۔ رات بھر ایک سانس میں منہ زبانی بھونکتا رہا۔ دوسری رات بھی وحشت کا یہی عالم رہا۔



البتہ چوبیس گھنٹے کی تربیت سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ فجر کے وقت جن اراکینِ خاندان کی آنکھ لگ گئی تھی، ان کے منہ چاٹ چاٹ کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ تیسرے رتھکے سے پہلے ہم نے اُسے ایک سونے کی گولی دی۔ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ چوتھی رات دو دیں، مگر حساب کیا مجال جو ذرا چپکا ہو جاتے۔ زنج ہو کر مرزا سے رجوع کیا تو کہنے لگے میری مانو، آج اسے کچھ نہ دو۔ خود تین گولیاں کھالو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس رات وہ بالکل نہیں بھونکا!

لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ صبح دس بجے ہمارے بہرے ہمسائے خواجہ شمس الدین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) نے بونٹے نئے پڑوس میں آتے تھے، ہمیں بڑی بدتمیزی سے جھنجھوڑ کر جگایا اور شکایت کی کہ رات بھی آپ کا کتا میرے گھر کی طرف منہ کر کے خوب بھونکا۔ اور (ہیئرنگ ایڈ یعنی سننے کا آلہ اپنے کان میں فٹ کرتے ہوئے) اور دیکھ لیجئے اس وقت بھی بہت جی لگا کے بھونک رہا ہے! ہم نے کہا، آپ کا ریڈیو بھی تو سارے سارے دن محلے کو سر پر اٹھاتے رکھتا ہے۔ خدا گواہ ہے جس دن سے آپ پڑوس میں اٹھ کر آتے ہیں، ہم نے اپنے ریڈیو پر پروگرام سننا بند کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے پاس تو کتے کا لائسنس بھی ہے۔ لائسنس کا نام آتے ہی ان کے چہرے کا رنگ سیاہ سے ہلکی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اور ان کا ریڈیو تین ہفتے تک خاموش رہے۔ البتہ ان کے چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے اپنی ہیئرنگ ایڈ کان سے لگا کر سنتے ہیں کہ ہمارا کتا بھونک رہا ہے یا سو گیا۔ ہمارے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑی کہ اب وہ ہر ایک سے یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ بعض نادہند اپنے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے کتے پال لیتے ہیں۔ وہ یہ کہتے بھی سننے گئے کہ سیزر اشرافوں کا کتا معلوم نہیں ہوتا۔ ادھر ان کی بیوی کی بدگمانی کا یہ حال تھا کہ سیزر جھوٹوں بھی دروازے میں سے جھانک لے تو جھٹ ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکال لیتی



تھیں۔

تین ہفتے بعد دیکھا کہ پھر منہ پھلاتے کلبہ احزاں کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے پر جوش السلام علیکم کے جواب میں فرمایا، دیکھیے، اس سور کے بچے نے کیا کیا ہے؟ مرزا بیچ میں بول اُٹھے۔ منہ سنبھال کر بات کیجیے۔ وہ کتے کا بچہ ہے۔ اس حملہ معترضہ کے بعد ہم بھی کچھ سخت بات کہنے والے تھے کہ مرزا نے جو اس وقت ہم سے ”کوڑو“ کھیل رہے تھے، ہمارے کہنی مار کر اپنی چھجّے دار بھوڑوں کی جنبش سے خواجہ شمس الدین کی باتیں ٹانگ کی طرف اشارہ کیا جو گھٹنے تک پائینچے سے بے نیاز تھی۔ ہم نے کن آنکھوں سے دیکھا تو زخم واقعی اتنا لمبا تھا کہ زپ لگا کر آسانی بند کیا جاسکتا تھا۔

”ندامت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے پوچھا:  
”کیا کتے نے کاٹا ہے؟“

”جی نہیں! میں نے خود ہی کاٹا ہے!“

”ارے صاحب! گھوڑے بھی کچھ کم ظالم نہیں ہوتے؟“ مرزا پھر بول اُٹھے۔  
مرزا کا یہ پریشانت دار ایسا اچانک اور کاری تھا کہ وہیں سیر ہو گئے۔ ایک دفعہ کو اپنے جسمانی زخم مہول گئے اور اندرونی چوٹوں کو سہلاتے اور گھوڑوں کی ماں بہنوں کو مارا بھری گالیاں دیتے ”فیڈ آؤٹ“ ہو گئے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ ان کے بزرگ خیبر پور سے گھوڑے بیچنے ہندوستان آتے تھے اور مالا مال ہو کر یہیں پڑ رہے۔ آگے چل کر ان بزرگوں کی اولاد کو انہی گھوڑوں کی ناسخف اولاد نے تباہ کر ڈالا۔ وہ اس طرح کہ اس خانوادے کے آخری چشم و چراغ خواجہ شمس الدین کی ”بلیک“ کی کمائی کی ایک پائی ریس میں انہی گھوڑوں کے بھیینٹ چڑھتی اور ان کے اپنے اہل و عیال انکم ٹیکس والوں کی طرح منہ دیکھتے رہ جاتے۔



اس نوع کی خوش طبعی سے قطع نظر سیزر ابتدائے سن بدتمیزی سے پرلے درجے کا کاہل واقع ہوا تھا اور دوڑ دوڑ کر کام کرنے کے بجائے دن کے بیشتر حصے میں دروازے پر محراب کی شکل میں چھاتی ہوئی بوگن دلیا \* کے سائے میں ٹوٹیں لگاتا رہتا۔ ورزی کی سوتی یوں تو ہر طرح کے کپڑے میں سے نکلتی ہے، مگر ایمان کی بات ہے، ہم نے سیزر کو کبھی کسی غلط آدمی کو کاٹتے نہیں دیکھا اور یہ کہنا تو سراسر غلط بیانی اور تہمت طرازی ہوگی کہ وہ بالکل جنگلی یلے کہا تھا۔ سدھاسدھایا ضرور تھا۔ مگر صرف پچاس فی صد۔ اس اجمال پر ملال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بچے حکم دیتے کہ جاؤ، اس راہ گیر کے پیچھے لگ جاؤ، تو یہ میرا شیر اپنی کمین گاہ سے نکل کر تعمیلاً جھپٹ پڑتا اور اس کی ٹانگی پکڑ کے ٹٹک جاتا۔ لیکن جب دوسرا حکم ملتا کہ چھوڑ دو تو مجال ہے جو چھوڑ دے۔

مرزا کو مبدیٰ فیاض نے حد درجہ محتاط اور وہمی طبیعت و دلالت کی ہے۔ یہیں یقین ہے کہ انھیں آبِ حیات بھی پینا پڑے تو بغیر اُبالے نہیں پیں گے۔ اسی وضع احتیاط کے باعث انھوں نے سیزر کے آنے کے بعد ہمارے ہاں آنا جانا اتنا کم کر دیا کہ کبھی بھولے بھٹکے آنے لگتے تو ہم سب ان کی ایسی خاطر مدارات کرتے، ایسی گرمجوشی سے ملتے کہ انھیں خدشہ ہونے لگا کہ ہم قرض نہ مانگ بیٹھیں۔ ایک دن ہمارے ایماء پر پروفیسر عبدالنقدوس مرزا کو طرح طرح سے سمجھانے لگے کہ کتا بڑا بے نظیر جانور ہے۔ کتے کے سوا کوئی جان دار پیٹ بھرنے کے بعد اپنے پالنے والے کا شکر ادا نہیں کرتا۔ غور کرو، دم دار جانوروں میں کتا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دم کو بطور آلہ اظہارِ خلوص و خوشنودی استعمال کرتا ہے۔ ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پونچھ سے صرف مکھیاں اڑاتے ہیں۔ رنبہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی \* بوگن دلیا۔ ایک زور و رویل جو بہت اونچی جاتی ہے اور جس میں بہت شمع رنگ کے پھول آتے ہیں خصوصاً سبز۔



دُم صرف کھانے کے کام آتی ہے۔ البتہ بیل کی دُم سے ”ایکسی لریٹر“ کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر تمہیں بیل گاڑی تھوڑی دوڑانی ہے۔ (مرزا کے زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے! ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہے کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں اتنے ہی کُتے اچھے لگتے ہیں! (الحجہ بیل کر) کُتوں سے ڈرنا بڑی نادانی اور بُزدلی ہے۔ خصوصاً دلاستی کُتوں سے! پھر مرزا کا ڈرنکالنے کے لیے انہی کے کھچڑی سر کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انگریزوں کے کُتوں کے دانت مصنوعی ہوتے ہیں! کھانے کے اور، کاٹ کھانے کے اور! قسموں سے بھی بات بنتی نظر نہ آتی تو ہماری طرف اشارہ کر کے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی تین ہفتے سے ایک دُم کُتا ”کا کر اسپنیل“ پلا پال رکھا ہے۔ (کا کر اسپنیل کی مشہور پہچان معلوم ہے؟ اس کے کان اس کی ٹانگوں سے لمبے ہوتے ہیں اور ٹانگیں اتنی چھوٹی کہ زمین تک نہیں پہنچ پاتیں!) دو ہفتے تک تو نیچے دن دن بھرا سے گود میں لیے بھونکنا سکھاتے رہے۔ مگر اب ان کو اس سے ذرا دُور ہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ جمعہ کو چھوٹے بچے نے کھیلنے کھیلنے اچانک اسے کاٹ کھایا۔ اپنے پہلے دانت سے۔ ابھی تک پتے کے فیلپین کے انجکشن لگ رہے ہیں۔

پروفیسر قاضی عبدالقدّوس بے دودھ کی کافی کے گھونٹ لے کر یہ سگ بیتی سنا رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے سیریز کو نہ جانے کیا ہرک اٹھی کہ بوگن ولیا کی اوٹ سے ان کے قہقہے سمو سے پر جھپٹا۔ کافی منہ کی منہ میں رہ گئی۔ بدحواسی میں پیالی مرزا کے سر پر گری (جس سے موخرانہ کر کئی جگہ سے چٹخ گیا) اور پروفیسر مذکور گرم کافی کا غرارہ کرتے ہوئے اپنے قد سے اُونچا پھانک پھلانگ گئے۔

مرزا نے پوچھا ”کتنے سے ڈر گئے؟“

”نہیں تو!“ وہ بھانٹک کے دوسری طرف سے بڑے خوددار لہجے میں تھر تھر کانپتے



ہوتے بولے۔

ممکن ہے یہ گفتگو کچھ دیر اور جاری رہتی، مگر موضوع گفتگو نے ایک ہی جہت میں پروں فاضل عبدالقدوس کو دبوچ لیا اور ان کی سڈول ران میں اپنے نو کیلے کیلے پرست کر دیے۔ وہ منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ چارپانچ دن پہلے بھی ایسی ہی گتھم گتھا ہو چکی تھی کہ کبھی گتا ان کے اوپر اور کبھی — اور کبھی وہ کتے کے نیچے! لہذا ہم نے پھر بوگن ولیا کی کانٹے دار ٹہنی توڑ کر ایک قمچی بنائی اور اس بد تمیز کو سڑاک سڑاک مارنے کو دوڑے۔ مگر پروفیسر موصوف جہاں کے تھاں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے، رُشد! یہ نہ کرو۔ ابھی تو میرے پچھلے نیل بھی نہیں مٹے!

جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھانپ لیا ہوگا، گتا پالنا تو ایک طرف رہا، گتھم گتھم اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے باہمی تعلقات کلٹنے اور کٹوانے کے کامیاب تجربہ سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ ورنہ ان کا علم الحیوانات اس حد تک کتابی یعنی ناقص ہے کہ ہمارے نیچے جس دن بازار سے طوطے کا پہلا جوڑا خرید کر لائے تو ان سے دریافت کیا چچا جان! ان میں نہ کون سا ہے اور مادہ کون سی؟ فاضل پروفیسر نے چارپانچ منٹ تک سوال اور جوڑے کو آٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر بہت محتاط انداز میں فرمایا ”بیٹا! یہ بہت طوطا چشم جانور ہوتا ہے۔ ابھی دو تین مہینے اور دیکھو۔ دونوں میں سے جو پہلے انڈے دینا شروع کر دے، وہی مادہ ہوگی۔“ خیر یہ لاعلمی تو انسانی معذوری سمجھ کر پھر بھی معاف کی جاسکتی ہے کیونکہ طوطا اپنی مادہ کو انسان کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے پہچان لیتا ہے، لیکن ایک دن ناصحانہ انداز میں بڑے تجربے کی بہت باریک بات یہ بتائی کہ یقین مانو، گتا رکھنے سے صحت بہتر ہو جاتی ہے یہ سننا تھا کہ مرزا نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ تعلقات میں فوراً بال پڑ گیا جو کئی دفعہ کافی پلا



کے بعد دُور ہوا۔

تعلقات جب از سر نو اس درجہ خوشگوار ہو گئے کہ ابے تے سے گفتگو ہونے لگی تو مرزا کو تپانے کے لیے وہ پھر شاتے سگ میں مشغول ہو گئے۔ ایک دن موج میں جو آئے تو بشارت دی کہ طبی نقطہ نگاہ سے کتابت مفید و مقوی جانور ہے۔ یہ سن کر مرزا انھیں مسلمان نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر اپنے ساتھ کے ان بیماروں کے نام گنوانے لگے جنھیں اس نسل نے تندرستی کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اور دُور کیوں جائیں۔ خود ان کو اپنے بالشت بھر کے پتے سے بے انتہا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ مرزا نے کہا ”ذرا کھول کے بات کرو۔“ بولے ”اب تم سے کیا پردہ۔ کتے کو روزانہ گوشت چلبھیے۔ اور یہ ہم پر گناہ پانے کے بعد ہی منکشف ہوا کہ پہلے ہمارے گھر میں روزانہ گوشت نہیں پچاتا تھا اور ہم بڑی لاعلمی میں زندگی بسر کر رہے تھے!“ اُن کی بنا سستی زندگی پر جو پردہ غفلت چالیس سال سے پڑا ہوا تھا، اُس کے دفعۃً اُٹھنے بلکہ چاک ہونے کے بعد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اب وہ اپنی صحت سے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ ایک نمبر بڑا جوتا پہننا شروع کر دیا تھا۔

ہم تو اس کو حُسن اتفاق ہی کہیں گے کہ مدتوں بعد پروفیسر موصوف کی تندرستی یکدم ایسی بجاں ہوتی کہ ہمیں رشک آنے لگا۔ اس لیے کہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ مینے میں تین چار دن بغیر دوا کے رہ سکتے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنے خیالی پلے کو صبح شام دو تین میل ٹھلانا پڑتا ہے۔

اُونچی ذات کے کتوں کی صحت بخش صحبت سے پروفیسروں کی کایا پلٹ جونا تو غیر شاعرانہ خیال آراتی ہے۔ تاہم اس کی گواہی سارا محلہ دے گا کہ ہمارے بعض افسانہ نویس



ہمسیوں کی گرتی ہوئی صحت پر سیزر کی موجودگی، خصوصاً اس کے بھونکنے کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ جس کا ایک دنی کرشمہ یہ تھا کہ غریب خلع کے سامنے سے گزرتے ہوئے لدھڑ سے لدھڑ پڑوسی کی چال میں ایک عجیب چوکناپن، ایک عجیب چستی اور لپک جھپک پیدا ہو جاتی تھی۔ سیزر غٹوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کروا دیتا تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود خواجہ شمس الدین (امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ) جو کہنے کو سیزر سے نالاں تھے، اُس کے فیضانِ صحت سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ سیٹھ صاحب موصوف کم و بیش پندرہ سال سے لو بلڈ پریشر (Low Blood Pressure) کے

علاج میں تھے۔ علاج معالجے ٹونے ٹونکوں پر لاکھوں روپے صرف کر چکے تھے۔ سب بے سود۔ اور اب یہ نوبت آگئی تھی کہ لالچی سے لالچی ڈاکٹر بھی انھیں اپنا مستقل مریض بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ مبادا انھیں روز روز مطب میں بیٹھا دیکھ کر دوسرے مریض بدل جائیں کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں لیکن ہمارے پڑوس میں آنے کے تین مہینے کے اندر اندر نہ صرف یہ کہ اُن کا ”بلڈ پریشر“ بڑھ کر نارمل ہو گیا بلکہ بفضلہ اس سے بھی پندرہ بیس درجے اوپر رہنے لگا۔ ان واقعات کا تعلق اس دورِ ناواقفیت سے ہے جب ہم کُٹاپا لانا کھیل سجتے تھے۔ کینل کلب کا باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ سیزر بچارا بالکل بے قصور تھا غلطی سراسر ہماری ہی تھی کہ کُتے کو مثل اپنی اولاد کے پال رہے تھے۔ یعنی ڈانٹ ڈانٹ کر۔ بڑے بڑے جگادریوں سے کُٹاپانے کے ادب آداب سیکھے تو پتہ چلا کہ کُتے کے ساتھ تو نرمی کا برتاؤ لازم ہے۔ بلکہ اس کے سامنے بچوں کو بے دردی سے پٹینا نہیں چاہیے ورنہ اس کی شخصیت پچک کر رہ جاتی ہے۔ اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ گھر کے ہر فرد نے اس پر بھونک بھونک کر اپنا گلا بٹھالیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے کُٹا بڑا ہوا، ہم میں بھی سمجھ آتی گئی اور ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ بند ہو گیا۔



سیر ہی کے دم خم سے آٹھ نو سال تک ایسی بے فکری رہی کہ کبھی تالا لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کو ہمارے مال و اسباب کی حفاظت کا اس درجہ خیال تھا کہ شامت کا مارا کوئی کوتا یا بلی باورچی خانے کے پاس سے بھی گزر جائے تو نہتھنے پھلا کر اس بُری طرح کھدڑتا کہ سارے چینی کے برتن ٹوٹ جاتے۔ گھر کی چوکیداری اور کام کاج میں اس طرح ہاتھ بٹانے کے علاوہ وہ ایک سمجھ دار کتے کے دیگر فرائض بھی انجام دیتا رہا جن سے صاف بڑے وفا آتی تھی۔ یہی نہیں کہ وہ ناشتے پر ہمارے لیے تازہ اخبار منہ میں دبا کر لاتا، بلکہ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو اخبار والا بل لے کر آتا تو اس پر بھونکتا بھی تھا۔ اور ایک منہ میں اخبار لانے پر ہی موقوف نہیں۔ وہ تو کہیے ہم نے خود دو تین دفعہ سختی سے منع کر دیا، ورنہ وہ تو ہمارے لیے توں بھی اسی طرح لاسکتا تھا۔ کھانے پر دونوں وقت وہ ہماری کہنی سے لگا بیٹھا رہتا اور حسب معمول ہم ہر پانچ لمحوں کے بعد ایک لقمہ اسے بھی ڈال دیتے۔ اگر وہ اسے سونگھ کر چھوڑ دیتا تو ہم بھی فوراً مارتا جاتے کہ ہونہ ہو کھانا باسی ہے۔ غرض کہ بہت ہی ذہین اور خدمتی تھا۔

وقت گزرا دکھائی نہیں دیا۔ مگر ہر چہرے پر ایک استان لکھ جاتا ہے۔ کل کی سی بات ہے۔ جب سیر بچہ سا آیا تھا تو پروفیسر قاضی عبدالقدوس جو سداسے یک رنگی کے قائل ہیں، اتوار کے اتوار موچنے سے اپنے سر کے سفید بال اکھاڑا کرتے تھے۔ بال وہ اب بھی اکھاڑتے تھے، مگر صرف کلے۔ (انھیں خود بھی اپنی عمر کا احساس ہو چلا تھا اور غالباً اسی رعایت کے تحت اب صرف بال بچوں والی عورتوں پر ان کی طبیعت آتی تھی۔) نادان بچوں کی وہ پہلی کھیپ جس نے سیر کے ذریعے انگریزی سیکھی، اب ماشاء اللہ اتنی سیانی ہو چکی تھی کہ اردو اشعار کا صحیح مطلب سمجھ کر شرمانے کے قابل ہو گئی۔ سیر بھی رفتہ رفتہ خاندان ہی کا ایک



معمّر رکن بن گیا — اس لحاظ سے کہ اب کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل میں اس کے لیے رفاقت و ہم سفری کا ایک احساس درد مندی و ہم نصیبی کا ایک رشتہ پیدا ہو چلا کہ ہم نے ایک دوسرے کو بوڑھا ہوتے دیکھا تھا۔ ایک ساتھ وقت سے ہار مانی تھی۔

آج اس کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ جوان تھا تو راہ چلتوں کا پنچے جھاڑ کر ایسا پیچھا کرتا کہ وہ گھگھیا کر قریب ترین گھر میں گھس جاتے اور بے آبرو ہو کر نکلے جاتے۔ وہ تاک میں رہتا اور نکلتے ہی اُن کے منہ اور گردن کو ہر دفعہ بانداڑ دیکر یوں بھنبھوڑتا گویا جانور نہیں، کسی انگریزی فلم کا ندیدہ ہیرو ہے (یہ مرزا کے الفاظ ہیں۔ کہتے ہیں انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہیں) ابھی تین ساں پہلے تک اُسے دیکھ کر پڑوسیوں کا چلوؤں خون سُکھتا تھا۔ مگر اب اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ دن بھر بوگن ولایا کے نیچے کسی مرشدِ کاہل کی طرح مراقبے میں پڑا رہتا۔ بہت ہوا تو وہیں سے لیٹے لیٹے دم ہلا کر شفقت کا اظہار کر دیا۔ البتہ چھوٹے بچوں کو، خواہ گھر کے ہوں یا پاس پڑوس کے، اُس نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بچہ اسے آواز دے کر گیند پھینکے اور وہ گودا بھری نلی چھوڑ چھاڑ، گیند اپنے منہ میں رکھ کر واپس نہ لائے۔ اس مُعلے میں اُسے بچوں کی تالیفِ قلوب اس درجہ عزیز تھی کہ کسی دفعہ فُٹ بال تک منہ میں رکھ کر لانے کی کوشش کی۔ اعضاء و جوارح رفتہ رفتہ جواب دے رہے تھے۔ ساری ٹن پھن غائب، عُرفش ختم۔ مرزا کے الفاظ میں اس کا بڑھا پاشاب پر تھا۔ کسی کسی دن سہ پہر تک بوگن ولایا کی چھاؤں میں وہی سنسنی خیز اردو اخبار اوڑھے اونگھتا رہتا، جس میں نوکر صبحِ قیمہ بندھوا کر لایا تھا۔ چاندنی اور ماداؤں کی مست مہک سے اب اس کے خون میں جوار بھاٹا نہیں آتا تھا۔ کہاں تو یہ عالم



تھا کہ ”گرمی“ پر آتا تو سرِ شام ہی سے زنجیر تڑا کر قدِ آدم دیوار بچاند جاتا اور فجر کی اذان کے وقت شاد کام لوٹتا۔ یا اب اس جوان دیدہ بزرگ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ گرمائی ہوتی مادہ اور ہڈی بیک وقت نظر آ جاتیں تو ہڈی پر ہی جھپٹتا تھا اور جب اس ہڈی کو پوچھتے پوچھتے اس کے بوڑھے جبڑے دکھنے لگتے تو اسے سُرخ بوگنِ ولیل کے نیچے دفن کر کے وضو کے لوٹے میں منہ ڈال کر پانی پینے چلا جاتا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی سیر رہے جس کے جبڑے کی مہر محلے کے ہر تیسرے آدمی کی پنڈلی پر آج تک گواہی دے رہی ہے کہ

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

وہی دم جو ایک زمانے میں بقول شخصے سوالیہ نشان کی طرح کھڑی رہتی تھی، اب مفلس کی مونچھ کی مانند لٹکنے لگی۔ اس کے ہم عمر ایک ایک کر کے وہ گلیاں سونی کر گئے، جہاں سے راتوں کو ان دیکھے بھید بھرے جسموں کی خوشبوؤں کے بلاوے آتے تھے۔ وہ تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا دل گرفتہ۔ نئی پود کے منہ زور کتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار وہ ان کے نو دو لٹنے مالکوں پر بھونکنا بھی اپنے رتبے کے منافی سمجھتا تھا۔ لیکن جس دن سے ماماہری کی جوان پھور بیٹی کلو پڑا بھری دوپہری میں ایک حلوائی کے بے نام کتے کے ساتھ بھاگی، وہ ہفتوں اپنے ہم جنس کی آواز تک کو ترسنے لگا۔ جب تنہائی سے بہت جی گھبرانے لگتا تو ریڈیو کے پاس آکر بیٹھ جاتا اور پکے گانے سن کر بہت خوش ہوتا۔

جسم کے ساتھ ساتھ نظر بھی اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ کبھی پروفیسر قاضی عبدالقدوس اُحلے کیڑے پہن کر آ جاتے تو انھیں اجنبی سمجھ کر بھونکنے لگتا۔ البتہ سماعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُکل سے گیند کا پھپکا کر رہا ہے اور اس کے ٹپا کھانے سے اس کی سمت اور محل وقوع کا اندازہ کر لیتا ہے۔ ایک دن شام کو اچھا خاصا بوگنِ ولیل کے نیچے اپنا مخصوص آسن



مارے (دائیں آنکھ، جو بچپن سے سُرخ رہتی تھی، آدمی بند کیے، باتیں پنچے پر تھو تھنی رکھتے) بیٹھا تھا کہ ایک نیلی ربن والی بچی نے ”شو“ کہہ کر سڑک پر پنگ پانگ کی گیند بھینکی۔ وہ آواز کی سیّد پر لپکا۔ مگر جیسے ہی گیند منہ میں پکڑ کے تیزی سے پلٹا، ایک کار کے بریک لگنے کی دلخراش آواز سنائی دی۔

نیچے چبھتے ہوئے دوڑے۔ سڑک پر دُور تک ٹانگوں کے گھسنے سے دوسرا پٹیاں بن گئیں۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ رُکی اور اپنے اسپرنگوں پر دو تین ہچکولے کھا کر غزاتی ہوئی تیزی سے پہلے ہی موڑ پر مڑ گئی۔ مگر سبز بیچ راستے ہی میں رہ گیا۔ اس کا پھیلاؤ کار کا پورا وزن سہا رہ چکا تھا۔ منہ سے خون جاری تھا۔ اور پاس ہی گیند پڑی تھی جواب سفید نہیں رہی تھی۔

سب نے مل کر اسے اٹھایا اور پھانک کے پاس بوگن ولیا کے نیچے لٹا دیا۔ لگتا تھا، شربانوں کے منہ کھل گئے ہیں۔ اور اُس کی زندگی دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ رِس رہی ہے۔ ضرب بہ ضرب، قطرہ بہ قطرہ، دم بہ دم۔ ہر ایک اسے چھو چھو کر انگلیوں کی پوروں سے دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔ — وہ دھڑکن جو دوسری دھڑکن تک ایک نیا جہم، ایک نئی جُمن بخشی ہے۔ کس جی سے کہوں کہ اس کا آب و دانہ اُٹھ چکا تھا اور وہ نصبت ہو رہا تھا اس بہت، اس حوصلے، اس سکون کے ساتھ، جو صرف جانوروں کا مقدر ہے بغیر کمرائے بغیر تڑپے، بغیر ہراساں ہوتے۔ بس بے نور نظریں جلاتے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ باری باری سب نے اسے چمکایا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ آنکھیں جھکالیتا تھا اور یہ یاد کر کے سب کی آنکھیں بھرا آئیں کہ اس کی زندگی میں آج پہلا موقع تھا کہ سر پر ہاتھ پھراتے وقت وہ جواباً اپنی ریشم سی ملائم دُم نہیں ہلا سکتا تھا۔ آج اس کے نتھنوں میں ایک اجنبی خون کی بو گھسی



جاری تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ چار پانچ کوٹے اوپر منڈلانے لگے اور دھیرے دھیرے اتنے نیچے اتر آتے کہ ان کے منحوس سلتے اس پر پڑنے لگے۔ کچھ دیر بعد اعلیٰ کی دیوار پر اسیٹے اور شور مچانے لگے۔ سیر نے ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اس کے نتھنے پھڑک اٹھے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ سم سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اس کا خون آلود منہ کھول کر سونے کی گولیوں کی شیشی حلق میں اُلٹ دی اور کالا آواز دیا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے پیار کرنے والوں کی دُندلاتی صورتیں دیکھتا دیکھتا ہمیشہ کے لیے سو گیا!

مارچ کے چڑھتے چاند کی بھگی بھگی روشنی میں جب بچوں نے مل کر اس کی محبوب بوگن دلیک کے نیچے زمین کی امانت زمین کو سونپنے کے لیے گہرا سا گڑھا کھودا تو چھوٹی بڑی بے شمار ہڈیاں نکلیں جنہیں وہ غالباً دفن کر کے بھول گیا تھا۔ دور دور تک بوگن دلیا کی لمبی لمبی انگلیوں جیسی جڑیں اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی زمین کے نیم گرم سینے میں اُترتی چلی گئی تھیں اور اس کا رس چوس چوس کر شاخوں کے سروں پر دکتے ہوئے پھولوں تک پہنچا رہی تھیں مگر سُوکھی پیاسی جڑوں کو آج سیر کے لہونے ان پھولوں سے بھی زیادہ سُرخ کر دیا ہوگا جو بچوں نے لحد کا مہ اپنی سیٹھوں اور تختیوں سے بند کر کے اوپر بکھیر دیے تھے۔ آخر میں نیلی ربن ڈالنی پچی نے اپنی سالگرہ کی موم بتیاں سر ہانے روشن کر دیں۔ ان کی اُداس روشنی میں بچوں کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی مکین اُجلی لکیریں صاف چاک رہی تھیں۔

کئی مہینے بیت گئے۔ پت جھڑکے بعد بوگن دلیا پھر اُکارے کی طرح دباک سیبتے مگر نیچے آج بھی اس جگہ کسی آدمی کو پاؤں نہیں رکھنے دیتے کہ وہاں بہا ایک ساختی سو رہا ہے۔



# بائے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے

دوسروں کو کیا نام رکھیں، ہم خود بیسیوں چیزوں سے چڑتے ہیں۔  
کرم کلا، پنیر، کبیل، کافی اور کافی، عورت کا گانا، مرو کا ناچ، گیندے کا پھول، اتوار  
کا ملاقاتی، مرغی کا گوشت، پاندان، غرارہ، خوبصورت عورت کا شوہر۔۔۔۔۔ زیادہ  
حدِ ادب کہ مکمل فہرست ہماری فرد گناہ سے بھی زیادہ طویل اور ہری بھری نکلے گی۔ گنہ گار  
سہی، لیکن مرزا عبدالودود بیگ کی طرح یہ ہم سے آج تک نہ ہوا کہ اپنے تعقیبات پر معقولاً  
کا نیم چڑھا کر دوسروں کو اپنی بے لطفی میں برابر کا شریک بنانے کی کوشش کی ہو۔ مرزا  
تو بقول کسے، غلط استدلال کے بادشاہ ہیں۔ ان کی حمایت و کالت سے معقول سے  
معقول کا زُ نہایت پھر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے ہم سب انہیں تبلیغِ دین اور  
حکومت کی حمایت سے بڑی سختی سے باز رکھتے ہیں۔ ان کی ایک چڑھو تو بتائیں، فہرست  
رنگارنگ ہی نہیں، اتنی غریب پرور بھی ہے کہ اس میں اس فقیر بے تقصیر کا نام ہی خاک  
اوپر پوزیشن پر شامل رہ چکا ہے۔ بعد میں ہم سے یہ پوزیشن بیگن کے بھرتے۔  
لی اور اس سے جیکی کیفٹی کے دولہا اوناکس نے مہیالی۔ مرزا کو آج جو چیز  
کل وہ دل سے اتر جاتے گی اور پرسوں تک یقیناً چڑبن جاتے گی۔ لوگ یہیں مرزا کا  
ہم۔ مہرازی نہیں، مہرازی بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس یگانگت و تقریب کے باوجود ہم و ثقی



سے نہیں کہہ سکتے کہ مرزا نے آلو اور ابوالکلام آزاد کو اول اول اپنی چڑکیسے بنایا۔ نیز دونوں کو تہائی صدی سے ایک ہی برکیٹ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟

## ہوئے یاسمن باقیست

مولانا کے باب میں مرزا کو جتنا کھڑچا، تعصب کے ملمع کے نیچے نہ اصل منطق کی یہ موٹی موٹی تہیں نکلتی چلی گئیں۔ ایک دن کئی وار خالی جانے کے بعد ارشاد فرمایا ایک صاحب طرز استاد پر داز نے باقی ندوۃ العلماء کے بارے میں لکھا ہے کہ شبلی پہلا یونانی تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ اس پر مجھے یہ گرہ لگانے کی اجازت دیجیے کہ یونانیوں کی اس اسلام دشمنی میں ابوالکلام آخری اہل قلم تھا جس نے اردو رسم الخط میں عربی لکھی! ہم نے کہا: ان کی شفاعت کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے مذہب میں فلسفے کا رس گھولا۔ اردو کردہ "نی کا سوز و آہنگ بخشا" فرمایا: ان کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا، اسی لیے مولوی عبدالحق علانیہ انھیں اردو کا دشمن کہتے تھے۔ علم و دانش اپنی جگہ مگر اس پر کیا کیجیے کہ وہ اپنی انا اور اردو پر آخری دم تک قابو نہ پاسکے۔ کبھی کبھار مضامین میں ان کا ترجمان القرآن پڑھتا ہوں تو (اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے) نعوز باللہ محسوس ہوتا ہے گویا کلام اللہ کے پرے میں ابوالکلام بول رہا ہے! ہم نے کہا: لا حول ولا قوۃ! اس بزرگ کی تمام کردہ و نا کردہ خطائیں تمہیں صرف اس بنا پر معاف کر دینی چاہئیں کہ تمہاری طرح وہ بھی چلنے کے ریلے تھے۔ کیا نام تھا ان کی پسندیدہ چلتے کا؟ اچھا سا نام تھا۔ ہاں! یاد آیا۔ وہاٹھ جیسین! یاسمن سفید! "تھنا تہ ہوئے۔ فرمایا: مولانا کا مشروب بھی ان کے "شرب کی مانند تھا۔ توٹے



ہوتے بتوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہل  
سومناں کو بھی قابل قبول ہو۔ یونانی فلسفے کی عینک سے جب انھیں دین میں دنیا اور  
خدا میں ناخدا کا جلوہ نظر آنے لگا تو وہ مسلمان ہو گئے اور سچے دل سے اپنے آپ پر  
ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ چینی چائے محض اس لیے ان کے دل کو بھاگتی کہ اس  
میں چائے کے بجائے چنبیلی کے گجرے کی لیٹ آتی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص جو چائے  
پینے کا ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہے، اس لیے چائے پیتا ہے کہ اس میں چائے کی  
فقط چائے کی۔ مہک آتی ہے، نہ کہ چنبیلی کے تیل کا بھبکا۔

ہم نے کہا ”تعجب ہے! تم اس بازاری زبان میں اس آب نشاط انگیز کا  
مضحکہ اڑا رہے ہو، جو بقول مولانا ”طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب  
کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔“ اس جملے سے ایسے بھڑکے کہ بھڑکتے چلے گئے۔  
لال پیسے ہو کر بولے ”تم نے لیٹن کھینی کا قدیم اشتہار چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں  
میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے، دیکھا ہوگا۔ مولانا نے یہاں اسی جملے کا ترجمہ اپنے تراجم کی آسانی  
کے لیے اپنی زبان میں کیا ہے!“ بحث اور دل شکنی کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔  
لیکن مزید نقل کفر کر کے ہم اپنی دنیا و عاقبت غراب کرنا نہیں چاہتے۔ لہذا اس تشبیہ  
کے بعد مرزا کی دوسری چٹری یعنی آکو کی طرف گریز کرتے ہیں۔

یہ دانت سلامت ہیں جب تک

مرزا کا ”باس“ دس سال بعد پہلی مرتبہ بین دن کی رخصت پر جا رہا تھا۔ اور

مرزا اپنے شیروں اور ہی خواہوں کو جشن نجات منانے کے لیے بیچ لکڑی ہڈی میں



فتح پر مدعو کیا تھا۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ سمندری کچھوے کا شوربہ ٹر ٹر پینے کے بعد مرزا سلم کیڑے (مسلم کے معنی یہ ہیں کہ مرحوم کی سالم ٹانگیں، کھیرے، آنکھیں اور مونچھیں بیٹ پر اپنی قدرتی حالت میں نظر آرہی تھیں) پر ٹوٹ پڑے۔ ہم نے کہا ”مرزا! ہم نے تمہیں چمکا مارتی نمیری نان کھاتے دیکھا ہے، کھروں کے چٹپٹے سریش میں ڈبو ڈبو کر جسے تم دل کے نہاری پلے کہتے ہو۔ مفت کی مل جاتے تو سٹرانڈی سارڈین بوں نگلتے ہو گویا تاکہ انہیں رکھتے۔ اور تو اور رنگامانی میں چمکا قبیلے کی ایک دوشیزہ۔ کہ ہاتھ سے اسیلا سبیل ایک فروٹ لپ لپ کھاتے ہوئے نوٹو کھنچوا چکے ہو۔ اور اس کے بعد پشاور میں چروں کے پوڑے کھاتے ہوئے بھی پکڑے جا چکے ہو۔ تمہارے مشرب اکل و شرب میں رہتے حلال ہے سوائے آکو کے!“

فیل گئے۔ فرمایا ”ہم نے آج تک کسی مولوی — کسی فرقے کے مولوی کی تندرستی ضرور نہیں دیکھی۔ نہ کسی مولوی کا ہارٹ فیل ہوتے سنا۔ جانتے ہو کیا وجہ ہے؟ پہلی وجہ تو یہ کہ مولوی کبھی ورزش نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ سادہ غذا اور سبزی سے پرہیز کرتے ہیں۔“

## ہوٹل غذا اور آکو کی عملداری

سبزی نہ کھانے کے فائدہ ذہن نشین کرانے کی غرض سے مرزا نے اپنی زیر تجربہ زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو آکو سے کیمیائی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ ذکر آکو کا ہے۔ انہی کی زبان غیبت، بیان سے اچھا معلوم ہوگا۔ —

نہیں تو کیا یاد ہوگا۔ میں دسمبر ۱۹۵۱ء میں ہسٹری گری گیا تھا۔ پہلی دفعہ کراچی



سے باہر جانے کی مجبوری لاحق ہوئی تھی۔ منٹگمری کے پلٹ فارم پر اترتے ہی محسوس ہوا گویا سردی سے خون رگوں میں جم گیا ہے۔ اُدھر چلتے کے اسٹال کے پاس ایک بڑے میاں گرم چلتے کے بجائے ملٹے کا رس پیے چلے جا رہے تھے۔ اس بندہ خدا کو دیکھ دیکھ کر اور دانت بجنے لگے۔ کراچی کا دائمی جس اور بغیر کھڑکیوں والا کمرہ بے طرح یاد آتے۔ قلی اور تلنگے والے سے صلاح و مشورے کے بعد ایک ہوٹل میں بستر لگا دیا۔ جس کا اصلی نام آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن منیجر سے لے کر مہتر تک سبھی اسے ہوٹل ہی کہتے تھے۔ کمرہ صرف ایک ہی تھا جس کے دروازے پر کوئلے سے بھری انگریزی وارڈوکر نمبر "لکھا تھا۔ ہوٹل ہذا میں نہ صرف یہ کہ کوئی دوسرا کمرہ نہیں تھا، بلکہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کی تعمیر کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا، کیونکہ ہوٹل کے تین طرف میونسپلٹی کی سڑک تھی اور چوتھی طرف اسی ادارے کی مرکزی نالی جو شہر کی گندگی کو شہر ہی میں رکھتی تھی، جنگل تک نہیں پھیلنے دیتی تھی۔ جزیرہ نما کمرہ نمبر "ایچیڈ ہاتھ روم" تو نہیں تھا، البتہ ایک ایچیڈ تنور ضرور تھا جس سے کمرہ اس کڑا کے کی سردی میں ایسا گرم رہتا تھا کہ بڑے بڑے "سنٹرلی ہیٹڈ" (Centrally heated) ہوٹلوں کو

مات کرتا تھا۔ پہلی رات ہم بنیان پہنے سو رہے تھے کہ تین بجے صبح جو تپش سے ایکایک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ امام دین بھرا ہمارے سر ہانے ہاتھ بھر لمبی خون آلود چھری لیے کھڑا ہے۔ ہم نے فوراً اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر چپکے سے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ پر چسپکی لی اور پھر کلمہ پڑھ کے اتنی زور سے چیخ ماری کہ امام دین اچھل پڑا اور چھری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو تین بیرے سمجھا بھجا کر اُسے واپس لے لائے۔ اس کے اوسان بجا ہوتے تو معلوم ہوا کہ چھری سے وہ ننھی ننھی بلیوں کی ذبح



کر رہا تھا۔ ہم نے ایک وقار کے ساتھ کہا ”عقلند آدمی! یہ پہلے کیوں نہ بتایا؟“ اس نے فوراً اپنی بھول کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ پہلے ہی بتا دیا کرے گا کہ چھری سے بٹیر ہی ذبح کرنا چاہتا ہے۔ نیز اس نے آسان پنجابی میں یہ بھی یقین دلایا کہ آئندہ وہ پیچ سُن کر ڈرپوکوں کی طرح خوفزدہ نہیں ہوا کرے گا۔

ہم نے رسان سے پوچھا ”تم انہیں کیوں ذبح کر رہے تھے؟“ بولا ”جناب ضلع منٹگمری میں جانور کو حلال کر کے کھاتے ہیں! آپ بھی کمائیں گے؟“ ہم نے قدے ترشروٹی سے جواب دیا ”نہیں!“ اور ریلوے ٹائم ٹیبل سے پنکھا جھلتے ہوئے سوچنے لگے کہ جو لوگ دو وہ پیتے بچوں کی طرح جلدی سوتے اور جلدی اُٹھتے ہیں وہ اس رمز کو کیا جانیں کہ نیند کا اصل مزا اور سونے کا صحیح لطف آتا ہی اس وقت ہے جب آدمی اٹھنے کے مقررہ وقت پر سوتا رہے کہ اسی ساعتِ ذرذیدہ میں نیند کی انڈتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی جانور کو صبح دیر تک سونے کی صلاحیت نہیں بخشی گئی۔ اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر خود کو مُبارکباد دیتے دیتے صبح ہو گئی اور ہم پوری اور آٹو چھولے کا ناشتہ کر کے اپنے کام پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معدے میں گرانی محسوس ہوئی۔ لہذا دوپہر کو آٹو پلاؤ اور رات کو آٹو اور پیپر کا قورمہ کھا کر تنور کی گرمائی میں ایسے سوئے کہ صبح چار بجے بیرے نے اپنے مخصوص طریقے سے ہمیں جگایا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ناشتے سے پہلے ہم سر جھکاتے قمیض کا بٹن نوچ کر پٹکون میں ٹانگنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سُوتی کھچ سے انگلی میں جک گئی۔ بالکل اضطراری طور پر ہم نے انگلی اپنی قمیض کی جیب پر رکھ کر زور سے دبائی، مگر جیسے ہی دوسری غلطی کا احساس ہوا تو خون کے گیلے دھبے پر سفید پاؤڈر چھڑک کر چھپانے لگے اور دل میں سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ



نے بیوی بھی کیا چیز بنائی ہے۔ لیکن انسان بڑا ہی ناشکر ہے۔ اپنی بیوی کی قدر نہیں کرتا۔ اتنے میں بیرا مقامی خالص گھی میں تلی ہوئی پوریاں لے آیا۔ منگمری کا اصلی گھی پاکستان بھر میں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اس میں چار فی صد گھی ہوتا ہے۔ بیرے نے حسب معمول اپنے ابروؤں سے تساہل سے ہمیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب ہم اس پر ہم کے ہندسے کی طرح تھرے ہو کر بیٹھ گئے تو ہمارے زانو پر گیلیا تو لینی بچھایا اور اس پر ناشتے کی ٹرے جا رکھ دی۔ ہم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے جھاڑن منہ میں ٹھونسے بڑے ادب سے ہنستے

☆ ممکن ہے بعض شکی مزاج قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر کمرے میں میز یا اسٹول نہیں تھا تو بان کی چارپائی پر ناشتہ کیوں نہ کر لیا۔ شکایت نہیں، اطلاع عرض ہے کہ جیسے ہی منگمری کا پہلا مرغ پہلی بانگ دیا، بیرا ہماری پیٹھ اور چارپائی کے درمیان سے بستر ایک ہی جھٹکے میں گھسیٹ لیا۔ اپنے زور بازو اور روزمرہ کی مشق سے اس کام میں اتنی صفائی اور مہارت پیدا کر لی تھی کہ ایک دفعہ سر ہانے کھڑے ہو کر جو بستر گھسیٹا تو ہمارا بنیان تک اتر کر بستر کے ساتھ لپٹ کر چلا گیا اور ہم کھڑی چارپائی پر کیلے کی طرح چھلے ہوئے پڑے رہ گئے۔ پھر چارپائی کو پائنتی سے اٹھا کر ہمیں سر کے بل پھیلاتے ہوئے کہنے لگا، ”صاب! فرنیچر خالی کرو!“ وجہ یہ کہ اس فرنیچر پر سارے دن ”پر ویا ٹرائینڈ منیجر ہوٹل ہذا“ کا دربار لگا رہا تھا۔ ایک دن ہم نے اس بے آرامی پر پُر زور احتجاج کیا تو ہوٹل کے قواعد و ضوابط کا نپل۔ سے لکھا ہوا ایک نسخہ ہمیں دکھایا گیا، جس کے سرورق پر ”ضابطہ فوجداری ہوٹل ہذا“ تحریر تھا۔ اس کی دفعہ ۹ کی رو سے فجر کی اذان کے بعد ”سجھر“ کو چارپائی پر سونے کا حق نہیں تھا۔ البتہ قریب المارگ مریض، زچہ اور ہیود و نصاریٰ اس سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن آگے چل کر دفعہ ۲۸ (ب) نے ان سے بھی یہ مراعات چھین لی تھیں۔ اس کی کڑی رو سے زچہ اور قریب المارگ مریض کو زچگی اور موت سے تین دن پہلے تک ہوٹل میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ”خلاف ورزی کرنے والوں کو بیروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔“



ہوئے پایا۔ ہم نے پوچھا ”ہنس کیوں رہے ہو؟“ کہنے لگا ”وہ تو فیجر صاب ہنس رہے تھے بولتے تھے، ہم کو لگتا ہے کہ کراچی کا پینجر ٹیر کو تیر سمجھ کے نہیں کھاتا!“

ہر چیز کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ ایک تاریک۔ دوسرا زیادہ تاریک۔ لیکن ایمان کی بات ہے اس پہلو پر ہماری نظر بھی نہیں گئی تھی۔ اور اب اس غلط فہمی کا ازالہ ہم پر واجب ہو گیا تھا۔ پھولی ہوتی پوری کا لقمہ پیٹ میں واپس رکھتے ہوئے ہم نے زندھی ہوتی آواز میں اس جبل ساز پرند کی قیمت دریافت کی۔ بولا ”زندہ یا مردہ؟“ ہم نے جواب دیا کہ ہم تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔ فی الحال مردہ کو ہی ترجیح دیں گے کہنے لگا ”اُس نے پیٹ ملتی ہے۔ ایک پیٹ میں تین ٹیرس ہوتی ہیں۔ مگر جناب کے لیے تو ایک ہی راس کافی ہوگی!“

قیمت سن کر ہمارے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ کراچی میں موشیوں کا گوشت کھاتے کھاتے طبیعت اگتا گئی تھی۔ لہذا دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جب تک سنگمری کا آب و دانہ ہے، طیور کے علاوہ کسی چیز کے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ لنچ پر بھنی ہوئی ٹیر چائے کے ساتھ ٹیر کا تنوری چرغا، سونے سے پہلے ٹیر کا آب جوش۔ اس ہاشی تنور میں فروکش ہوتے ہیں چوتھا دن تھا، اور تین دن سے یہی لالے تلے تھے۔ چوتھی صبح ہم زانو پہ تولیہ اور تولیے پر ٹرے رکھے تلی ہوئی ٹیر سے ناشتہ کر رہے تھے کہ بیر نے جھاڑن پھر منہ میں ٹھونس لی۔ ہم نے چک کر پوچھا ”اب کیا بات ہے؟“ کہنے لگا ”کچھ نہیں۔ فیجر صاب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے کہہ میرا کہ ہاتھ ٹیر لگ گئی ہے! ہم نے طنزاً اٹیچڈ تنور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”تمہارے ہوش اب ایں اور کون سا من و سلمی اترتا ہے؟“ بولا ”حرام گوشت کے علاوہ دنیا بھر کی ڈش ملتی ہے۔ جو



چاہیں آرڈر کریں، جناب!۔۔۔۔۔ آٹو مٹر، آٹو گو بھی، آٹو مینٹی، آٹو گوش، آٹو چھٹی، آٹو بریا  
 اور خدا تمہارا بھلا کرے۔۔۔۔۔ آٹو کوفتہ، آٹو بریاں، آٹو سموسہ، آٹو کارائتہ، آٹو کا بھرتا  
 آٹو کیمیاں \*..... ہم نے روک کر پوچھا ”اور سوپٹ ڈش؟“ بولا ”آٹو کی کھیر“ ہم  
 نے کہا ”بھلے آدمی! تم نے تو آٹو کا پہاڑہ سنا دیا۔ تمہارے ہوٹل میں کوئی ایسی ڈش  
 بھی ہے جس میں آٹو کا نام نہ آتے۔ فائنڈ بٹسم کے ساتھ فرمایا ”کیوں نہیں! پوسٹے ٹو  
 کٹ! حاضر کروں جناب؟“

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک سال پہلے مالک ہوٹل اندانے ہیڈ کانسٹبل کے  
 عہدے سے سکدوش ہو کر زراعت کی طرف توجہ فرماتی۔ اور زمین سے بھی انہی ہتھکنڈوں  
 سے سونا اگلوانا چاہا۔ مگر ہوا یہ کہ آٹو کی کاشت میں پچیس سال کی ذہانت سے جمع کی ہوئی  
 رشوت ہی نہیں، بلکہ فیشن اور پراویڈنٹ فنڈ بھی ڈوب گئے۔  
 زمین کھا گئی بے ایماں کیسے کیسے

پس انداز کیسے ہوتے آٹوؤں سے ہوٹل کے دھندے کا ڈول ڈالا۔ جنہیں اب اس کے  
 بہترین دوست بھی تازہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سنا ہے بٹیر بھی اسی زلمے میں پاس پڑوس کے  
 کھیتوں سے پکڑ لیے تھے!

مکالمہ در مذمت آٹو

”مرزا! یہ بٹیر نامہ اپنی جگہ، مگر یہ سوال ابھی ترشہ ہے کہ تم آٹو کیوں نہیں  
 کھاتے“ ہم نے پھر وہی سوال کیا۔  
 \* آٹو قیہ



”نہیں صاحب! آؤ کھانے سے آدمی آؤ جیسا ہو جاتا ہے۔ کوئی انگریز عورت جسے اپنا ”فلر“ اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے، آؤ کو چھوٹی تنک نہیں۔ سلمے ’سوئنگٹول‘ میں پیر لٹکائے، یہ میم جو مصر کا بازار کھولے بیٹھی ہے، اسے تم آؤ کی ایک ہوائی بھی کھلا دو تو بندہ اسی حوض میں ڈوب مرنے کو تیار ہے۔ اگر یہ کافی میں چینی کے چار دانے بھی ڈالتی ہے، یا کوئی اسے میٹھی نظر سے بھی دیکھ لے، تو اس کی کیلوریز کا حساب اپنی دھوبی کی کاپی میں رکھتی ہے۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”مرزا! کیا میمیں بھی دھوبی کی کاپی رکھتی ہیں؟“

”ہاں! ان میں کی جو کپڑے پہنتی ہیں، وہ رکھتی ہیں!“

ہماری تشنگی، علم بڑھتی دیکھ کر مرزا نے آؤ کی ہجو میں دلائل و نظائر کا طومار باندھ دیا۔ جہاں کہیں منطق کے ٹاٹ میں ذرا سا سُوراخ بھی نظر آیا، وہاں محلی مثال کا بڑا سا پیوند اس طرح لگایا کہ جی چاہتا تھا کچھ اور سُوراخ ہوتے۔ کہنے لگے کرنل شیخ کل رات ہی یورپ سے لوٹے ہیں۔ کہہ رہے تھے یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جو لڑکی دُور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر سترہ برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دُور سے سترہ برس کی دکھلائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے! مگر یہ وضعداری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دُور سے نظر آتی

★ انگریز: مرزا کی عادت ہے کہ تمام سفید فام غیر ملکیوں کو انگریز کہتے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے انگریز، جرمنی کے انگریز، یہ کہ انگلستان کے انگریز۔

+ کیلوریز: حرارے۔ غذائی اکائیاں۔



ہے وہی پاس سے۔ چنانچہ مگر تک بالوں والی بولنے کی دُور سے انہیں سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی انہیں ہی سال کا ”چپٹی“ نکلتا ہے! اخیر سنی سنائی باتوں کو چھوڑو۔ اس میم کا مقابلہ اپنے ہاں کی آٹو خور خواتین سے کرو۔ ادھر فانوس کے نیچے سُرخ ساری میں جو محترمہ بیٹرکس بنی لیکے اکیلے گیا گپ بہت اسٹیکسا اور آؤ اڑا رہی ہیں۔ اماں! گنوارو کی طرح انگلی سے اشارہ مت کرو۔ ہاں! ہاں! وہی۔ ارے صاحب! کیا چیز تھی! لگتا تھا ایک ابھرا سیدھی اجنتا کے غاروں سے چلی آرہی ہے اور کیا فکر تھا۔ کہتے ہونے زبان سوہیل کھاتی ہے۔

چلتی تو قدم یوں رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں

پہلے پہل مارچ ۱۹۵۱ میں دیکھا تھا۔ وہ صبح یاد آتی ہے تو کوئی دل پر دستک سی دینے لگتا

ہے۔ اور اب؟ اب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بارہ سال پہلے کی Go-Go Girl

گوشت کے انبار میں کہیں کھو گئی ہے۔ عشق اور آؤ نے ان حالوں کو پہنچا دیا۔

ہم نے کہا ”ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ!“ بولے ”اہل زبان کے محاورے انہی

کے خلاف اندھا دھند استعمال کرنے سے پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔ حمیرہ وہ آئیڈیل

عورت تھی، جس کے خواب ہر صحت مند آدمی دیکھتا ہے۔ یعنی شریف خاندان،

خوبصورت اور آوارہ! اردو، انگریزی، فرنچ اور جرمن فرائٹ سے بولتی تھی، مگر کسی بھی

زبان میں ”نہ“ کہنے کی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ حسن اور جوانی کی بشرکتِ غیرے مالک تھی۔

یہ دونوں اشیائے لطیف جب تبرک ہو گئیں اور پلکوں کے سائے گہرے ہو چلے تو مالے

باندھے ایک عقدِ شرعی بھی گیا۔ مگر ایک مہینے کے اندر ہی دُولہا نے عروسی مکر بند کا پھندا

گلے میں ڈال کر خودکشی کر لی۔ جاتے تھے کشمکش عقد سے آزاد کیا۔ پھر تو ایسے کان ہوتے



کہ اس بچاری نے شرعی تکلفات سے خود کو کبھی مکلف نہیں کیا۔ صاحب! مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اُکتا جاتا ہے تو شادی کر لیتا ہے۔ اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن عورت ذات کی بات اور ہے۔ بدی پہ آئی ہوئی عورت جب پریشان یا پشیمان ہوتی ہے تو ٹی۔ ایس۔ ایلٹ کے بقول گراموفون ریکارڈ لگا کر اپنے جوڑے کو میکانیکی انداز سے تھپتھپاتے ہوئے خواب گاہ میں بولائی بولائی نہیں پھرتی، بلکہ غذا سے غم غلط کرتی ہے۔ حمیرہ نے بھی مرد کی بے وفائی کا مقابلہ اپنے معدے سے کیا۔ تم خود دیکھ لو۔ کس رفتار سے آٹو کے قتلے قاب سے پیٹ اور پیٹ سے پیٹ میں منتقل کر رہی ہے۔ بس اسی نے صورت سے بے صورت کر دیا۔

ہم نے اُن کا وقت اور اپنی رہی سہی عزت بچانے کی خاطر ان کی اس 'تھیوری' سے جھٹ اتفاق کر لیا کہ زنانہ آوارگی کی روک تھام کے لیے عقد اور آٹو سے بہتر کوئی آلہ نہیں کہ دونوں سے بد صورتی اور بد صورتی سے نیک چلنی زور پکڑتی ہے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم نے کہا "لیکن اگر آٹو سے واقعی مٹاپا پیدا ہوتا ہے تو تمہارے حق میں تو الٹا مفید ہوگا۔ کیوں کہ اگر تمہارا وزن صحیح مان لیا جائے تو معیاری حساب سے تمہارا قد تین فٹ ہونا چاہیے۔ ایک دن تمہیں نے بتایا تھا کہ آستیں کے لحاظ سے ۷ انمبر کی قمیض تمہیں فٹ آتی ہے اور کالر کے لحاظ سے ۱۳ انمبر!"

کرشمے کا ربوہ ایڈریٹ کے

اسی سال جن میں مرزا اپنے دفتر میں اگنا کر سٹی کا تازہ ناول پڑھتے پڑھتے اچانک بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو خود کو ایک آرام دہ کلینک (CLINIC) میں کمپنی



کے خرچ پر صاحبِ فراش پایا۔ انہیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ جس مقام پر انہیں دل کا شدید درد محسوس ہوا تھا، دل اس سے بالشت بھر دور نکلا۔ ڈاکٹر نے وہم دور کرنے کی غرض سے انگلی رکھ کر بتایا کہ دل یہاں نہیں، یہاں ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہیں دل کا درد دل ہی میں محسوس ہونے لگا!

جیسے ہی ان کے کمرے سے ”مریض سے ملاقات منع ہے“ کی سختی ہٹی، ہم زینیا کا گلہ ستہ لے کر عیادت کو پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر خوب روئے۔ نرس نے آکر دونوں کو چپ کرایا اور ہمیں علیحدہ لے جا کر متنبہ کیا کہ اس اسپتال میں بیمار پرسی کرنے والوں کو رونا اور کراہنا منع ہے۔ ہم نے فوراً خود پر فرمائی بشت طاری کر کے مرزا کو ہراساں ہونے سے منع کیا اور تلقین کی کہ مریض کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے۔ ہماری نصیحت کا خاطر خواہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔

”تم کیوں روتے ہو پگلے؟“ ہم نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”یونہی خیال آگیا کہ اگر تم مر گئے تو میری عیادت کو کون آیا کرے گا!“ مرزا نے اپنے آنسوؤں کے رُومال میں محفوظ کرتے ہوئے وجہ رقت بیان کی۔

مرض کی اصل وجہ ڈاکٹروں کے نزدیک کثرتِ افکار تھی جسے مرزا کی زبانِ قادرِ البیان نے کثرتِ کار بنا دیا۔ خیر، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مرزا چلنے کے ساتھ آٹو کے ”چپس“ اڑا رہے تھے۔ ہم نے کہا ”مرزا! آج تم رنگے ہاتھوں کپڑے گئے۔“ بولے (اور ایسی آواز میں بولے گویا کسی اندھے کنوئیں کے پنیڈے سے بول رہے ہیں) ”ڈاکٹر کہتے ہیں تمہارا وزن بہت کم ہے تمہیں



آؤ اور ایسی چیزیں خرّیب کھانی چاہیں جن میں اسٹارج اور کاربوہائی ڈریٹ کی افراط ہو۔ صاحب! آؤ ایک نعمت ہے، کم از کم سائنس کی رُوسے! ہم نے کہا تو پھر دباؤ اب آؤ کھا کر ہی صحت یاب ہو جاؤ۔ فرمایا ”صحت یاب تو مجھے ویسے بھی ہونا ہی پڑے گا۔ اس لیے کہ یہ زریں اس قدر بد صورت ہیں کہ کوئی آدمی جو اپنے منہ پر آنکھیں رکھتا ہے، یہاں زیادہ عرصے پڑا نہیں رہ سکتا!“

## وُمنے لگے، وہ شکایتیں، وہ منے منے کی حکایتیں

کلینک سے نکلتے ہی مرزا نے اپنی توپوں کا رخ پھیر دیا۔ نوگرہجو کے شب روز اب آؤ کی تعریف و توصیف میں بسر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا کہ ویت نام پر امریکی بمباری کی خبریں پڑھ کر مرزا پچتا واکرتے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے بڑی نادانی کی۔ مگر اب پیار میں آتے تو آؤ کی گد رانی ہوئی گولائیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے ”صاحب! کولمبس جہنم میں نہیں جائے گا۔ اُسے واپس امریکہ بھیج دیا جائے گا! مہذب دنیا پر امریکہ کے دو احسان ہیں: تمباکو اور آؤ۔ سو تمباکو کا بیڑا تو سلطان غرق کر دیا۔ مگر آؤ کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا، اتنا ہی آؤ اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔“

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حریف ظریف سائنسی ہتھیاروں سے زیر نہیں ہوا تو شاعری کی مار سے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ ”صاحب! جوں جوں وقت گزرتا ہے، یادداشت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ پہلے اپنی پیدائش کا دن ذہن سے اُترا۔ پھر مہینہ۔ اور اب تو سنہ بھی یاد نہیں رہتا۔ بگیم یا کسی بدخواہ سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اکثر تمھارے لطیفے



تمہیں ہی سننے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ تو جب تم پیٹ پکڑ پکڑ کر منسنے لگتے ہو تو شک گزرتا ہے کہ لطیفہ تمہارا ہی ہوگا۔ سیکم اکثر کہتی ہیں کہ کاک ٹیل پارٹیوں اور ڈانس میں تمہیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے! غرض کہ حافظہ بالکل چوڑھا ہے۔ اب یہ آؤں گا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی کسی بچے کے ہاتھ میں بھول میں سنکا ہوا آؤں نظر آجائے تو اس کی مانوس مہک سے بچپن کا ایک ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ میں ٹکٹ کی باندھ کر اسے دیکھتا ہوں۔ اس سے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے پرے ایک بھولی بسری صورت ابھرتی ہے۔ گرد آؤں بالوں کے پیچھے شرارت سے روشن آنکھیں۔ کرتا بٹنوں سے بے نیاز۔ گلے میں غلیل۔ ناخن دانتوں سے کترے ہوئے۔ پتنگ اڑانے والی انگلی پر ڈور کی خون آؤں لکیر۔ بیرمی سمے ہوئے اپنی کینچلیاں اتارنا چلا جاتا ہے۔ اور میں ننگے پاؤں تسلیوں کے پیچھے دوڑتا، رنگ برنگے بادلوں میں ریزگاری کے پہاڑ، پروں اور آگ اُگلنے اڑدہوں کو بنتے بگڑتے دیکھتا — کھڑا رہ جاتا ہوں.....“

”یہاں تک کہ آؤ ختم ہو جاتا ہے! ہم نے صابن کے بلبے پر پھونک ماری۔  
 سنبھلے۔ گردشِ ایام کو اپنے بچپن کے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے لگام کھینچی۔  
 اور گالی دینے کے لیے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا..... خدا جانے حکومت  
 آؤ کو بزورِ قانون قومی غذا بنانے سے کیوں ڈرتی ہے۔ ستا اتنا کہ آج تک کسی  
 سیٹھ کو اس میں ملاوٹ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اسکنڈل کی طرح لذیذ اور زود ہضم!  
 وٹامن سے بھرپور، خوش ذائقہ، صوفیانہ رنگ، چھلکا زنا نہ لباس کی طرح۔ یعنی برائے نام  
 صاف، ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو“



## دستِ خود و ہاںِ خود

مرزا پر اب یہ جھک سوار تھی کہ اگر صندل کا گھسنا اور لگانا دوسرے کے لیے مفید ہے تو اسے اگانا کہیں زیادہ مفید ہونا چاہیے۔ حکمت و زراعت کی جن پُر خاراہوں کو متانہ طے کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے، ان کا اعادہ کیا جائے تو طب پر ایک پوری کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ از بسکہ ہم حکیموں کی لگی لگائی روزی پہ ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے، اس لیے دو تین چنگاریاں چھوڑ کر دور کھڑے ہو جائیں گے۔

ایک دن ہم سے پوچھا ”بچپن میں کھٹ مٹھے بیر میرا مطلب ہے جھربیری کے بیر کھائے ہیں؟“ عرض کیا ”جی ہاں! ہزار دفعہ۔ اور اتنی ہی دفعہ کھانسی میں مبتلا ہوا ہوں۔“ فرمایا ”بس یہی فرق ہے، خرید کے کھانے میں اور اپنے ہاتھ سے توڑ کے کھانے میں۔ تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بیر توڑتے وقت انگلی میں کانٹا لگ جلتے اور خون کی بوند پور پر تھر تھرانے لگے تو اس پاس کی جھاڑیوں کے نام بیر میٹھے ہو جاتے ہیں!“

”سائنٹیفک دماغ میں یہ بات نہیں آتی“ ہم نے کہا۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ زیادہ ابلے ہوئے آلو کی طرح تر ٹختے بکھرتے چلے گئے۔ کہنے لگے ”صاحب! بعض حکیم یہ کرتے ہیں کہ جس کا معدہ کمزور ہو اسے اوجھڑی کھلاتے ہیں۔ جس کے گردوں کا فعل درست نہ ہو اسے گروے۔ اور جو ضعفِ جگر میں مبتلا ہو اسے کلیجی۔ اگر میں حکیم ہوتا تو تمہیں مغز ہی مغز کھلاتا!“

راقم الحروف کے عضوِ ضعیف کی نشاندہی کرنے کے بعد ارشاد ہوا ”اب



آٹو خود کاشت کرنے کی سائنٹیفک وجہ بھی سن لو۔ پچھلے سال اُترتی برسات کی بات ہے۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کالے تیتھر کی تلاش میں کچے میں بہت دور نکل گیا۔ مگر ایک تیتھر نظر نہ آیا، جس کی وجہ ”گائیڈ“ نے یہ بتائی کہ شکار کے لیے آپ کے پاس ڈپٹی کنسٹر کا پرمٹ نہیں ہے۔ واپسی میں رات ہو گئی اور ہماری ۱۹۴۵ ماڈل جیپ پر دمے کا دورہ پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ ضعیفہ تو ایک گڑھے میں آخری ہچکلی لے کر خاموش ہو گئی مگر اپنے قفسِ عنصری میں ہمارے طاہرُ روح کو پرواز کرتا چھوڑ گئی۔ ہم اسٹیمرنگ پر ہاتھ رکھے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ رحمتِ ایزدی سے جیپ گڑھے میں گری، ورنہ گڑھے کی جگہ کنواں ہوتا تو اس وقت خدا کا شکر کون ادا کرتا؟ نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا! ہمارے قرض خواہوں پر کیا گزرتی؟ ہمارے ساتھ رقم کے ڈوبنے پر اُنھیں کیسے عبر آتا کہ ابھی تو ہمارے تمسک کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوتی تھی؟ ہم ابھی اُن کے اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیر رہے تھے کہ ایک کسان بکری کا نوزائیدہ بچہ گردن پر منظر کی طرح ڈالے ادھر سے گزرا۔ ہم نے آواز دے کر بلایا۔ ابھی ہم اتنی ہی تہید باندھنے پلتے تھے کہ ہم کراچی سے آنے ہیں اور کالے تیتھر کی تلاش میں تھے کہ وہ گڑھے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تیتھر پانی میں نہیں رہتے۔ ہمارے گائیڈ نے ہماری فوری ضرورت کی ترجمانی کی تو وہ ایسا پسچا کہ اپنی بیل گاڑی لانے اور اسے جیپ میں جوت کر اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اور وہ بھی بلا معاوضہ! صاحب! اندھا کیسے چاہے؟.....“

”دو آنکھیں!“ ہم نے جھٹ لقمہ دیا۔



”غلط! بالکل غلط! اگر اس کی عقل بھی بینائی کے ساتھ زائل نہیں ہوتی ہے تو اندھا دوا نکھیں نہیں چاہتا، ایک لالٹھی چاہتا ہے!“ مرزا نے محاورے کی بھی اصلاح فرمادی۔

ہم ہونکارا بھرتے رہے، کہانی جاری رہی ”تھوڑی دیر بعد وہ بیل گاڑی لے آیا جس کے بیل اپنی جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اڈوان کی رستی سے جیب باندھتے ہوئے اس نے ہمیں بیل گاڑی میں اپنے پہلو میں اگلی سیٹ کی پیش کش کی۔ اور ڈیڑھ دو میل دور کسی موہوم نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلی دینے لگا:

”اوجیڑی نویں لائین بلدی پٹی اے نا اوجی میرا گھاروے“ \*

گھر پہنچتے ہی اُس نے اپنی پگڑی اُتار کر چارپائی کے سیروے والے پائے کو پہنا دی۔ منہ پر پانی کے چھپکے دیے اور گیلے ہاتھ سفید بکری کی پیٹھ سے پونچھے۔ برسات کی چاندنی میں اس کے کرتے پر بڑا سا پیوند دور سے نظر آ رہا تھا۔ اور جب تھوٹی پر لٹکی ہوئی نئی لائین کی نو بھڑکی تو اس پیوند میں لگا ہوا ایک اور پیوند بھی نظر آنے لگا جس کے ٹانگے ابھی اس کی مسکراہٹ کی طرح اُجلے تھے۔ اس کی گھروالی نے کھڑی چارپائی پر کھانا چن کر ٹھنڈے سیٹھے پانی کے دودھات کے گلاس پٹی پر بان چھدرا کر کے جما دیے۔ میزبان کے شدید اصرار اور بھوک کے شدید تر تقاضے سے مجبور ہو کر جو ہم نے خشک چنائی شروع کی ہے تو یقین مانو پیٹ بھر گیا مگر جی نہیں بھرا۔ رال ننگلتے ہوئے ہم نے پوچھا ’چودھری! اس سے مزے دار آلو کا ساگ ہم نے آج تک نہیں کھایا۔ کیا ترکیب ہے پکانے کی؟‘

\* وہ جہاں نئی لائین جل رہی ہے نا۔ وہی میرا گھر ہے۔



بولاً بادشاہو! پہلے تے اک گلے زمین وچ پہنچ من امرکیہ دی کھا دیاؤ۔ فیر

.....★

## قصہ آلو کی کاشت کا

بات اگر اب بھی گلے سے نہیں اُتری تو ”خود اگاؤ، خود کھاؤ“ سلسلے کی تیسری داستان سنیے جس کا عذاب ثواب مرزا کی گردن پر ہے کہ وہی اس کے فردوسی ہیں اور وہی رستم۔ داستان کا آغاز یوں ہوتا ہے :

”صاحب! بازار سے سڑے بسے آؤ خرید کر کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی چنے بھسکتا پھرے۔ پرسوں شام ہم خود آؤ خریدنے گئے۔ شبراتی کی دکان سے۔ ارے صاحب! وہی اپنا شبراتی جس نے چودہ پندرہ سال سے وہ سائن بورڈ لگا رکھا ہے :

مالکِ ایں دکان شبراتی مہاجرین

(گر کوئی دعویٰ کند باطل شود)

بمقام موضع کاٹھ، عقب جامع مسجد کلاں

پوسٹ آفس قصبہ بانگپت، ضلع میرٹھ۔

حال مقیم کراچی۔

ہم نے ایک آؤ دکھاتے ہوئے کہا ”میاں شبراتی! حال مقیم کراچی! تمہارے آؤ تو پیلے ہیں۔ خراب لگتے ہیں۔“ بولاً ”باؤ جی! خراب نکلیں تو کالا ناگ (اُس کے گدھے

★ پہلے ایک ایکڑ زمین میں پانچ من امریکی کھا دیاؤ پھر.....

(اُس زمانے میں کمیائی کھا د امرکیہ سے آتی تھی۔)



کا نام کے موت سے مونچھ منڈوا دینا۔ درحقیقت میں یہ پہاڑی آٹو ہیں۔ ہم نے کہا  
 ”ہمیں تو کراچی سے پانچ سو میل تک کوئی پہاڑ نقشے میں نظر نہیں آتا“ بولا ”باؤجی!  
 تمہارے نقشے میں اور کون سی پھل پھلا ری کراچی میں بخر آوے ہے؟ یہ رُپے چھٹانک  
 کا سانچہ پان جو تمہارے غلام کے کلتے میں بتائے کی طریقوں گھل ریا ہے، بمقام بنگال  
 سے آریا ہے۔ یہاں کیا دم دُرود رکھتا ہے۔ حالیت تو یہ ہے باؤجی! کراچی میں مٹی  
 تلک ملیرے آوے ہے۔ کس واسطے کہ اس میں ڈھاکہ سے منگا کے گھانس لگا دیں گے۔  
 جوانی قسم باؤجی! پشاور کے چوک یادگار میں مرغا اذان دیوے ہے تو کہیں جا کے کراچی  
 والوں کو شج اندا نصیب ہووے ہے!“

اور ایک مرد غیرت مند نے چمن زار کراچی کے دل یعنی ہاؤسنگ سوسائٹی  
 میں آٹو کی کاشت شروع کر دی۔ اگرچہ سر دست پانچ من امریکی کھاد کا انتظام نہ ہو سکا،  
 لیکن مرزا کا جوش جنوں انھیں اس مقام پر پہنچا چکا تھا، جہاں کھاد تو کھاد، وہ بغیر  
 زمین کے بھی کاشت کرنے کا جگرار کھتے تھے!

مرزا عبدالودود بیگ اور کھیتی باڑی! ہمارا خیال ہے کہ سارا کھیت ایر کنڈیشن  
 کر دیا جائے اور ٹریکٹر میں ایک راکنگ چیئر (جھولا کرسی) ڈال دی جائے تو مرزا شاید  
 دو چار گھنٹے کے لیے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کر لیں، جس کے بارے میں ان کا  
 مبلغ علم بس اس قدر ہے کہ انھوں نے سینما کے پردے پر کلین شیو ایکٹروں کو  
 چپاتی پہ مصنوعی بال چپکائے، اسٹوڈیو کے سورج کی دھوپ میں سگریٹ کی پتی  
 چڑھی ہوئی درختیوں سے باجرے کے کھیت میں سے مٹکا کے بھٹے کاٹتے دیکھا  
 ہے۔ یہاں یہ بتانا غائبانہ محل نہ ہوگا کہ اس سے چند سال پیشتر مرزا باغبانی کا



ایک انتہائی نادر اور اتنا ہی ناکام تجربہ کر کے ہمیں ایک مضمون کا خام مواد مہیا کر چکے تھے۔ انہیں ایک دن اپنے کوٹ کاننگا کالر دیکھ کر دفعۃً القا ہوا کہ ہونے کو تو گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے سوائے روپے کے، لیکن اگر باغ میں گلاب کے گلے نہیں تو جینا فضول ہے۔ انہیں زندگی میں اچانک ایک زبردست خلا محسوس ہونے لگا جسے صرف امریکی کھاد سے پُر کیا جاسکتا تھا۔

اب جو آلو کی کاشت کا سودا سر میں سمایا تو ڈیڑھ دو ہفتے فقط اس موضوع پر ریسرچ ہوتی رہی کہ آلو بخارے کی طرح آلو کے بھی بیج ہوتے ہیں یا کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلو کی بھی ٹہنی کاٹ کر صاف ستھرے گلے میں گاڑ دی جاتی ہے۔ نیز آلو پیٹ سن کی مانند گھٹنوں گھٹنوں پانی مانگتا ہے یا اخروٹ کی طرح بغیر محنت کے پُشت پُشت تک پھل دیتا رہے گا۔ دورانِ تحقیق ایک شق کہیں سے یہ بھی نکل آئی کہ بینگن کی طرح آلو بھی ڈال ڈال پہ لٹکیں گے یا ترنی کی بیل کی طرح پڑوسی کی دیوار پہ پڑے رہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے تو یہ شوشہ بھی اٹھایا کہ اگر رفع شر کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ آلو واقعی زمین سے اُگتے ہیں تو ڈنٹھل کا نشان کیسے مٹایا جائے؟

## چھپا دستِ ہمت میں دستِ قضا ہے

پھر کیا تھا۔ کوئٹہ سے بذریعہ پی۔ آئی۔ اے سفید گلاب کی قلمیں منگائی گئیں۔ گملوں کو کھولتے پانی اور فنانل سے ”ڈس انفکٹ“ کیا گیا۔ پھر کوئٹہ کے نازک و نایاب گلاب کو کراچی کی دیک اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اوباش بکری کی مینگنی کو گرم کھاد میں اتنی ہی امریکی کھاد اور امریکی کھاد میں ہموزن ڈی۔ ڈی۔ ٹی پاؤڈر ملا لیا گیا



اُبلے ہوئے پانی سے صبح و شام سینچائی کی گئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان گملوں میں کبھی کوئی کیرا نظر نہیں آیا۔ اور نہ گلاب!

پروفیسر قاضی عبدالقدوس کچھ غلط تو نہیں کہتے کہ مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر اور بحبل کہ بخدا بالکل الہامی معلوم ہوتی ہے!

پایانِ کار مرزا نے آٹو کی کاشت کے لیے زمین یعنی اپنا ”لان“ (جس کی افرتی گھاس کی ہریالی ایسی تھی کہ سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے دل دکھاتا تھا) تیار کیا۔ اس زراعتی تجربے کے دوران جہاں جہاں عقل محو تماثلے لب بام رہی، وہاں جوشِ نرود بے خطر گلزارِ خلیل میں کود پڑا۔ دفتر کے چیراسیوں، اپنے پالتو خرگوش اور محلے کے لونڈے لاڑھیوں کی مدد سے دو ہی دن میں سارا لان کھود پھینکا۔ بلکہ اس کے بعد بھی یہ عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ دوسری منزل کے کرایہ داروں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے کھدائی رکوئی، اس لیے کہ مکان کی نیو نظر آنے لگی تھی۔

$$س + ک \times \text{موزہ} = \frac{\text{کمر}}{۳۲}$$

کوئٹہ کے گلاب کی طرح آٹو کو بھی کراچی کی نظر کھا گئی۔ مگر پنج وقتہ نلانی، گورانی اور کھدائی سے رگ پٹھوں میں جو چستی اور طبیعت میں چونچالی آگئی تھی، وہ اُسے آٹو کی کرامات سمجھتے تھے۔ اب کی دفعہ جو لنچ پر نہیں ہوٹل اسٹرکانٹی نٹل کے چاندنی لاونج میں لے گئے تو سم نے دیکھا کہ بونے میز پر سوائے ان کیمیائی تجربات کے جو یورپین باورچیوں نے نسلاً بعد نسل آٹو پر کیے تھے اور کچھ نہ تھا۔ آٹو مُسلم، آٹو دونیم، آٹو سوختہ و کوفتہ، آٹو چھلکے دار، آٹو بریاں، آٹو نیم بریاں، بلکہ کہیں کہیں



بالکل عریاں!

”مرزا! یہ کیا؟“

”ٹرپل بی (Busy Businessmen's Buffet)“

”یا اللہ! کراچی کے کروڑ پتی یہ کھاتے ہیں! مگر ہم نے تو انکم ٹیکس کی چوری بھی نہیں کی۔ پھر یہ سزا کیوں؟ مجھ کو کا ہی مارنا تھا تو ہمیں گز بھر کی ٹائی بندھوا کے نو منزلیں لانگتے پھلانگتے یہاں کاہے کو لائے؟ نیچے ہی نقد پیسے دے کر رخصت کر دیتے۔“

”ہماری صحبتیں اٹھاتے ایک عمر گزری، مگر رہے جنگلی کے جنگلی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ’فایو اسٹار‘ (اعلیٰ درجہ) ہوٹلوں میں قیمت کھانے کی نہیں دی جاتی، اس رومانی فضا کی دی جاتی ہے، جہاں آپ دوسرے معززین کو اپنی طرح مجھ کا مترادف دیکھتے ہیں۔ بل میں جو رستم درج ہوتی ہے وہ بساندے گوشت اور ابلے چھندر کی قیمت نہیں ہوتی۔ دراصل اس میں گھر سے بھلگنے کا مجرمانہ، دوسری میزوں پر بیٹھی ہوتی خواتین کے فریج سینٹ لگانے کا تاوان، کھلکھلاتی ہوئی وٹیرس کے ٹوتھ پیسٹ کی قیمت بلکہ اس کا پورا نان نفقہ شامل کرنا پڑتا ہے، جب جا کے کہیں ایک بل بنتا ہے۔ اور جہاں تک لذت کا تعلق ہے تو صاحب! ہر شب آنگن میں اترنے والے من و سلوی کے مقابلے میں باہر کی پیاز کی گنٹھی مزادے جاتی ہے۔ ورنہ دیکھا جائے تو چائے کی پیالی گھر کی انگیٹھی پر ”چراغ تلے“ جلا کر بھی بنائی جاسکتی ہے اور — اور صاحب! دس دس روپے کے نوٹ جلا کر بھی! جیسا کہ کس بے کی ”ہٹ“ میں تمہارے اُس بیٹا سیٹھ نے کیا تھا! مصری بلی ڈانس کی خاطر۔“



”مگر وہ تو خاصی PLUMP تھی۔“

”صاحب! مصری تو اسی چیز پر جان دیتے ہیں۔ جیسی تو شاہ فاروق فریہندہ داشتائیں اس طرح اکٹھی کیا کرتا تھا جیسے بچے ڈاکہ کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں!“

بحث اور یہیں اس ڈھلوان پر لا کر مرزا نے سراپا کے اعدادِ ثلاثہ (مثلاً ۳۷-۲۴-۳۵) کی جانچ پڑتال کرنے کا خود ساختہ فارمولا پیش کیا جو بے کم و کاست ندرِ قارئین ہے :-

نازنین کے سینے کے ناپ میں گولھوں کا ناپ جوڑو۔ میزان کو اپنے (صاف) موزے کے نمبر سے ضرب دو۔ پھر اس حاصل ضرب کو ۳۲ سے تقسیم کر دو۔ جو جواب آئے وہ کمر کا مثالی ناپ ہوگا۔ اب اگر کمر کا پھیر اس سے زیادہ نکلے تو آٹو سے پرہیز لازم ہے اور اگر اس سے کم ہے تو آٹو کھلا کھلا کر جسم کو فارموں کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ ہوٹل کے بل کی پشت پر انھوں نے بال پائنٹ قلم سے مارلن منرو، جینا لوو بریجڈیا، الزبتھ ٹیلر، صوفیہ لارین اور چیدہ چیدہ پری سکیروں کو ایک ایک کر کے اپنے گیارہ نمبر کے موزے میں ایسا اتارا کہ ہم بھونچکے رہ گئے۔ اس میں آپ کو جھوٹ یا عبارت آرائی کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے تو دو چار مشقی سوال نکال کر آپ بھی اپنی جان بچانے کے حسینوں کا امتحان کر لیجیے۔ ہم تو اسے ملکہ وکٹوریہ کے بت، کوکا کولا کی بوتل اور خود پر آزما کر اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔

..... اُس کی شبوں کا گداز

یہیں ڈیڑھ مہینے کے لیے کام سے ڈھاکہ جانا پڑا اور مرزا سے ملاقاتوں کا سلسلہ



موقوف ہو گیا۔ خط و کتابت کا مرزا کو دماغ نہیں۔ جیسے ہی ہم واپس آئے، انناس اور منشی گنج کے کیلوں سے لے پھندے مرزا کے ہاں پہنچے۔ ہم نے کہا ”السلام علیکم!“ جواب ملا ”پھل اندر پہنچا دو۔“ وعلیکم السلام! غور سے اُن کی صورت دیکھی تو دل پہ چوٹ سی لگی۔

”یہ کیا حال بنا لیا تم نے؟“

”ہمیں جی بھر کے دیکھ لو۔ پھر اس صورت کو ترسو گے۔ اشتہا ختم۔ دواؤں پر گزارا ہے۔ دن بھر میں تین انگور کھا پاتا ہوں۔ وہ بھی چھلکا اتار کے۔ کھانے کے نام سے ہول اٹھتا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر وقت ایک بیکلی سی رہتی ہے۔ ہر چہرہ اُداس اُداس، ہر شے دُھوا آں دُھواں۔ یہ ہونکتا سٹاٹا، یہ چیت کی اُداس چاندنی، یہ...“

”مرزا! ہم تمہیں رو مینٹک ہونے سے روک تو نہیں سکتے لیکن یہ مہینہ چیت کا نہیں ہے۔“

”چیت نہ سہی، چیت جیسا ضرور ہے، ظالم۔ تم تو ایک ہندو لڑکی سے دل بھی لگا چکے ہو۔ تمہیں بتاؤ، یہ کون سے مہینے کا چاند ہے؟“ مرزا نے سوال کیا۔

”اسی مہینے کا معلوم ہوتا ہے“ ہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمیں بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ صاحب! عجیب عالم ہے۔ کام میں ذرا جی نہیں لگتا۔ اور بیکاری سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ ذہن پر اگندہ بلکہ سچ پوچھو تو محض گندہ۔ تارو بھرے آسمان کے نیچے رات رات بھر آنکھیں پھاڑے تمہاری حاکمتیں گنات رہتا ہوں۔ تینہا سے دل گھبراتا ہے۔ اور لوگوں سے ملتا ہوں تو جی چاہتا ہے منہ نوچ لوں اور صاحب! ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں



”مرزا! ہونہ ہو یہ عشق کے آئینہ ہیں!“

”بجا۔ لیکن اگر صاحبِ معاملہ پر چالیس مہاوٹیں پڑ چکی ہوں، تو یہ آئینہ عشق کے نہیں، اسر کے ہیں۔ کھانا کھاتے ہی محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے حلق سے لے کر معدے تک تیزاب کی پھریری پھیر دی ہے۔ ادھر کھایا، ادھر پیٹ پھول کر مشکیزہ ہوا ہنسی کا رخ بھی اندر کا طرف ہو گیا ہے۔ سارا فتور آٹو کا ہے۔ معدے میں ایسٹ، بہت بننے لگا ہے۔ پیپٹک اسر ہو گیا ہے۔“ ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”اس میں ہراساں ہونے کی کیا بات ہے۔ آج کل کسی کو ہارٹ اٹیک، یا اسر نہ ہو تو لوگ اس پر ترس کھانے لگتے ہیں کہ شاید بیچارہ کسی ذمہ دار عہدے پر فائز نہیں ہے، مگر تم تو ملازمت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہو۔ اپنے ’باس‘ سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بات کرتے ہو۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ وقت پر سوتے ہو۔ وقت کے بعد اٹھتے ہو۔ دادا کے وقتوں کی چاندی کی پتیلی میں اُبلے بغیر پانی نہیں پیتے۔ وضو بھی پانی میں ’سٹرین‘ ملا کر کرتے ہو، جس میں ۲۶ فی صد الکحل ہوتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے خود کو بے خبر رکھتے ہو۔ باتوں کے علاوہ کسی چیز میں ترشی کو روا نہیں رکھتے۔ تیل بھی تم نہیں کھاتے۔ سو سال سے تو ہم خود دیکھ رہے ہیں، غمگمری کا خالص دانے دار گھی کھا رہے ہو۔“ ہم نے کہا۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ یہ سب اسی منحوس کا فتور ہے۔ اب کی دفعہ جو سونے کے کشتہ سے زیادہ طاقت بخش گھی کا سر مہرنترا اپنے ہاتھ سے انگیٹھی پر تپایا تو معلوم ہے تہ میں کیا نکلا؟ تین تین انگل آٹو کی دانے دار لگدی! جی بھی تو میں کہوں کہ میرا بنیان تو تنگ ہو گیا، مگر وزن کیا نہیں بڑھ رہا!“ مرزا نے آخر اپنے دس سالہ مرض



کی جڑ پکڑ لی، جو ضلع غنٹگری تک پھیلی ہوئی تھی۔

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

پہلے مرزا کو درد کی ذرا برداشت نہیں تھی۔ ہمارے سامنے کی بات ہے پہلی دفعہ پیٹ میں درد ہوا تو ڈاکٹر نے ہارنیا کا انجکشن تیار کیا۔ مگر مرزا نے گھکیا کر منٹیں کہیں کہ انہیں پہلے کلوروفارم سنگھا دیا جائے تاکہ انجکشن کی تکلیف محسوس نہ ہو! لیکن اب اپنی بیماری پر اس طرح اترانے لگے تھے جیسے اکثر اوجھے اپنی تندرستی پر اڑتے ہیں۔ ہمیں ان کی بیماری سے اتنی تشویش نہیں ہوتی جتنی اس بات سے کہ انہیں اپنے ہی نہیں پرانے مرض میں بھی اتنی ہی لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ بھانت بھانت کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں سے اس طرح گریڈ گریڈ کر متعدد تفصیلات پوچھتے کہ رات تک ان کے سارے مرض اپنا لیتے۔ اس حد تک کہ بخار کسی کو چڑھتا، سر سامی باتیں وہ کرتے۔ اس ہمدردانہ طرز عیادت سے مرزا نے خود کو زچگی کے سوا ہر قسم کی تکلیف میں مبتلا کر لیا۔ گھریا دفتر کی قید نہیں، نہ اپنے بیگلے کی تخصیص، ہر ملاقاتی کو اپنی آنتوں کے ناقص فعل سے آگاہ کرتے اور اس سیاب صفت ریاحی درد کا لفظی گراف بناتے جو مصافحہ کرنے وقت نفخ و قراقر کا محرک تھا۔ پھر دائیں آنکھ کے پوٹے میں ”کرنٹ“ مازتا، متورم جگر کو چھیدا، ٹہلی ہوئی ناف کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ پھلے پہر اچانک پلٹا اور پیٹ کر دل میں بڑے بڑے خیال پیدا کرنے لگا۔ اور پھر مرزا ہر بڑے خیال کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جن لوگوں نے مرزا کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ مرد بیا



جو فالوں پر سر جھکاتے، اس کی تپک مٹانے کے لیے ہر دوسرے گھنٹے ایک گلاس دودھ منہ بنا کر پی لیتا ہے، یہ چار مہینے قبل کو فتنے میں ہری مرچ بھروا کر کھاتا تھا اور اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو شام کو یہی کو فتنہ ہری مرچ میں بھروا دیتا تھا۔ یہ نیم جاں جو بے مہج مسالے کے رات کو ”انگلش فوڈ“ کہہ کر صبر و شکر کے ساتھ کھا رہا ہے، یہ وہی چٹورا ہے جو چار مہینے پہلے یہ بتا سکتا تھا کہ صبح سات بجے سے لے کر رات کے نو بجے تک کراچی میں کس ”سوٹ میٹ مرحپٹ“ کی کڑھائی سے اُترتی گرم جلیبی مل سکتی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے کون سے چینی رستوراں میں تلے ہوئے جھینگے کھانے چاہئیں جن کا چوگنا بل بناتے وقت مالک رستوراں کی بیٹی اس طرح مسکراتی ہے کہ بخدا روپیہ ہاتھ کا میل معلوم ہوتا ہے۔ انھیں نہ صرف یہ پتہ تھا کہ لاہور میں زیورات کی کون سی دکان میں نہایت سبک ”ہیرا تراش“ کلاتیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ مزنگ میں رنگا کباب کی وہ کون سی دکان ہے جس کا ہسٹڈ آفس گو جرانوالہ میں ہے اور یہ بھی کہ کڑکڑا جاڑوں میں رات کے دو بجے لال کُرتی کی کس پان کی دکان پر پنڈی کے من چلے طرح کے پانوں سے زیادہ ان کے رسیلے ناموں کے مزے لوٹنے آتے ہیں۔ قصہ خوانی کے کس مچھیل حلوائی کی دکان سے کالی گلاب جامن اور ناطنم آباد کی کون سی چورنگی کے قریب گلاب میں بسا ہوا قلاقند قرض پر مل سکتا ہے؟ (اطلاعا عرض ہے کہ مرزا نقد پیسے دے کر مٹھائی خریدنا فضول خرچی سمجھتے ہیں) بھلا کوئی کیسے یقین کر لیتا کہ یہ آٹو اور ”کاربوہائی ڈریٹ“ کا شکار وہی ہے جس نے کل تک من بھاتے کھانوں کے

\* یہ مفید مطلب معلومات مرزا کے ملک گیر چٹور پن کا پتہ ہیں۔ انھوں نے ساری عمر اور کیا ہی کیا ہے۔ اپنے دانستوں سے اپنی قبر کھودی ہے۔



کیسے کیسے ایسے جوڑے بنا رکھے تھے۔۔۔۔۔ کھڑے مسلے کے پسندے اور  
 عیسیٰ روٹی، قیمہ بھرے کر لیے اور گھی میں ترتراتے پراٹھے، مدراسی بریانی اور پارسی کھانے  
 (وہ بھی ایک لکھنوی پڑوسن کے ہاتھ کے) چپڑی روٹی اور ارد کی پھریری دال بھنڈی  
 اور۔۔۔۔۔ بھنڈی! (بھنڈی کے ساتھ مرزا کسی اور چیز کو شامل کرنے کے  
 روادار نہیں)

مرزا کو کھانے کا ایسا ہوکا ہے کہ ایک منہ انھیں ہمیشہ نا کافی معلوم ہوتا ہے!  
 ان کے ندیدے پن کو دیکھ کر ایک دفعہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے کہا  
 تھا ”مرزا! تمہارا حال گرگٹ جیسا ہے۔ اس کی زبان کی لمبائی اس کے جسم کی آدھی  
 ہوتی ہے!“ مرزا کی اُداس آنکھیں ایک دم مُسکرا اُٹھیں۔ کہنے لگے ”صاحب! خدا  
 نے ایک پارہ گوشت کو جانے کس لذت سے ہمکنار کر دیا۔ اگر سارا بدن اس لذت  
 سے آشنا ہو جاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی بھٹ جاتی!“

مرزا پانچ چھ ہفتے میں پلنگ کو لات مار کر کھڑے ہو گئے۔ ہم تو اسے اُن کی  
 قوتِ ارادی کی کرامات ہی کہیں گے، حالانکہ وہ خود کچھ اور وجہ بتاتے تھے۔ ایک دن اُن  
 کے معدے سے خون کٹ کٹ کر آنے لگا۔ ہمیں چشمِ پُر آب دیکھا تو ڈھارس دینے لگے  
 ”میں مُسلمان ہوں۔ جنت کا بھی قائل ہوں۔ مگر مجھے وہاں جانے کی جلدی نہیں ہے۔ میں  
 موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں ابھی مر نہیں سکتا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اول  
 تو تم میری موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکو گے۔ دوم، میں پہلے مر گیا تو تم مجھ پر مضمون  
 لکھ دو گے!“ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ خوفِ خاکہ سے صحت یاب ہوئے یا بقول شخصے مرغی  
 کے غسلِ میت کے پانی سے جسے وہ چکن سوپ کہہ کر نوش جان فرما رہے تھے۔ بہر حال،



بیاری جیسے آتی تھی، اُسی طرح چلی گئی۔ فائدہ یہ ہوا کہ آٹو سے جو بیزاری پہلے بلا وجہ تھی، اب اس کی نہایت معقول وجہ ہاتھ آگئی۔ اور یہ سراسر مرزا کی اخلاقی فتح تھی۔

مرض الحمد للہ دور ہو چکا تھا۔ پرہیز البتہ جاری تھا۔ وہ اس طرح کہ پہلے مرزا ڈاکٹر کے کھانے کے بعد آدھ سیر جلیبی اکیلے کھا جاتے تھے۔ لیکن اب ڈاکٹروں نے میٹھا بند کر دیا تھا۔ لہذا آدھ سیر امرتی پر اکتفا کرتے تھے۔

## آٹو کا منہ کالا، بھنڈی کا بول بالا

جیسے ہی مرزا کی صحت اور طبیعت معمول پر آئی، بغدادی جم خانہ میں یار لوگوں نے شایان شان پیمانے پر غسلِ صحت کے جشن کا اہتمام کیا۔ استقبالیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ گھسے پٹے ڈنر ڈانس کے بجائے فینسی ڈریس بال کا اہتمام کیا جائے تاکہ ایک دوسرے پر ہنسنے کا موقع ملے۔ مہمان خصوصی تک یہ بھنک پھنچی تو انھوں نے ہماری بانی کہلا بھیجا کہ نئے مضحکہ خیز لباس سلوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ممبران اور ان کی بیگیاں اگر ایمانداری سے وہی کپڑے پہنے پہنے جم خانہ چلے آئیں، جو وہ عموماً گھر میں پہنے بیٹھے رہتے ہیں تو منتشر پورا ہو جائے گا۔ رقص کے لیے البتہ ایک کڑی شرط مرزا نے یہ لگا دی کہ ہر ممبر صرف اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرے گا، مگر اس لپک اور ہنک سے گویا وہ اس کی بیوی نہیں ہے! جشن کی رات جم خانہ کو جھنڈیوں اور بھنڈیوں سے دھن بنایا گیا۔ سات کورس کے ڈنر سے پہلے رونی اور کاغذ سے بنے ہوئے ایک قد آدم آٹو کی ارنجنگ نکالی گئی، جس پر مرزا نے اپنے ہاتھ سے برانڈی چھڑک کر ماچس دکھائی اور سرگباشی کے ”ڈپل“ پر گاف کلب مار کے کریا کر م کیا۔ ڈنر کے بعد مرزا پر ٹائلٹ پیپر کے پھول برائے



گئے اور کچی کچی بھنڈیوں میں تو لا گیا جن پر ابھی ٹھیک سے سُہری رُواں بھی نہیں نکلاتھا۔ پھر یہ بھنڈیاں مستحقین یعنی معدے کے لکھ پتی مریضوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ شہپین سے مہکتے ہوئے بال روم میں غبارے چھوڑے گئے۔ خالی بوتلوں کی قیمت کا عطیہ ایک یتیم خانے کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ اور غسلِ صحت کی خوشی میں کارڈ روم والوں نے جوئے کے اگلے پھلے سارے قرضے معاف کر دیے۔

مرزا بات بے بات مُسکرا رہے تھے۔ تیسرا رقص ختم ہوتے ہی ہم اپنی کُنہیوں سے راستہ بنتے ہوئے اُن تک پہنچے۔ وہ اس لمحے ایک بڑے غبارے میں چلتے ہوئے سگرٹ سے سُورخ کرنے چلے تھے کہ ہم نے اس کا ذکر چھیڑ دیا جس کی جناب میں کل تک گستاخی فرشتہ پسند نہ تھی۔ ”مرزا! آکو اگر اتنا ہی مضر ہے تو انگلینڈ میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ ایک انگریز اوسطاً دس اونس آلو یومیہ کھا جاتا ہے۔ یعنی سال میں ساڑھے پانچ من! سن رہے ہو، ساڑھے پانچ من!“ بولے ”صاحب! انگریز کی کیا بات ہے! اس کی مفلسی سے بھی ایک شان ٹپکتی ہے۔ وہ پُٹا بھی ہے تو ایک ہسکٹری کے ساتھ! لن یو تانگ نے کہیں لکھا ہے کہ ہم چینیوں کے بارے میں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قحط پڑتا ہے تو ہم اپنے بچے تک کھا جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم انہیں اس طرح نہیں کھاتے جس طرح انگریز ”بیف“ کھاتے ہیں یعنی کچّا! ہم بھی جواباً کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ایک نکیلی اڑی جو ایک حسین بوجھ سا ہوتے تھے، ہمارے بچے میں برے کی طرح اُترتی چلی گئی۔ ہماری مردانہ چیخ

FOR HE IS A JOLLY GOOD FELLOW

کے کورس میں دب گئی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا برمی سا گوان کا ڈانس فلور بہکے بہکے قدموں تلے پھر چر جانے لگا۔



## پروفیسر

آج پھر ان کے اعزاز میں حضرت رنجور اکبر آبادی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروف  
ریڈر، سید ماہی "نیا افق" نے ایک عصرانہ دیا تھا۔

جس دن سے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی گولڈ میڈلسٹ (مرزا  
سے روایت ہے کہ یہ طلائی تمغہ انھیں مڈل میں بلاناغہ حاضری پر ملا تھا) یونیورسٹی کی ملازمت  
سے مستعفی ہونے کے بعد بنک آف چاکر سولیمین بحیثیت ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز اینڈ ایڈوکیٹ  
دھانس دیے گئے تھے، اُن کے اعزاز میں اس قسم کے عصرانے استقبالیے اور عثمانیے روزمرہ  
دفتری زندگی کا جزو بلکہ جزو بدن بن گئے تھے۔ گھر پر اکل حلال تو صرف دورانِ علالت ہی  
زہر مار فرماتے تھے، ورنہ دونوں وقت "اعزازیہ" کھاتے تھے۔ بنک کی ملازمت پروفیسر  
موسروف کے لیے ایک عجیب تجربہ ثابت ہوئی، جس کی قیمت وہ بہر طور مہینے کی تیس تا پانچ  
کو وصول کر لیتے تھے۔

معاف کیجئے، اس خاکے میں ہم انھیں پروفیسر ہی کہیں گے۔ بقول "ابا" آدمی  
ایک دفعہ پروفیسر ہو جاتے، تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے، خواہ بعد میں سمجھ داری کی  
باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ درس و تدریس تو ایک حیلہ شرعی تھا، ورنہ بھول مول  
تجسس میں آزاد پروفیسر کا "پیشہ توکل تھا اور بے دماغی سے اُسے رونق دیتے تھے۔"



وہ کسی کے دیبل نہیں تھے۔ دبنگ اور دلیر آدمی تھے اور خطرے سے ڈرنا یا بچنا تو کجا، بسا اوقات سانپ کو رسی سمجھ کر گتھ مرتے تھے۔ ان کی جرارت اب شجاعت سے گزر کر تھوڑا اور تھوڑے سے گزر کر حماقت کی ماورائی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ کوئی شخص اُن سے ملازمت، بحث یا برج میں سمقت لے جاتے تو اس کے پورے صوبے سے نفرت ہو جاتی تھی۔ برصغیر ہندوستان کا کوئی صوبہ بچا ہوگا، جس سے ان کی ذاتی عداوت نہ ہو۔ بلکہ اب تو چھوٹی چھوٹی تحصیلیں آنکھیں دکھانے لگی تھیں۔

وائس چانسلر کو بھری میٹنگ میں "ٹٹ اپ" کہنے کے بعد وہ تین مہینے کی رخصت لے کر گھر بیٹھ گئے۔ اور احتجاجاً اخبار تک پڑھنا ترک کر دیا کہ اس میں گاہے ملے وائس چانسلر کی تصویر چھپ جاتی تھی۔ یوں بھی انھوں نے زندگی بھر زبان کے علاوہ کسی دوسرے عضو کو تکلیف نہیں دی تھی، لیکن اب چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ بلا کی چستی دکھاتے تھے۔ وہ اس وقت سب بادل بھر آرام کر رہے پر اُونگھتے رہنے کے بعد وہ شام کو آٹھ بجے سونے کے لیے بڑی بچہ سے جست لگا کر بلیک پر چڑھتے تھے۔ اپنے پیشے سے تنگ آ چکے تھے اور کہتے تھے کہ تمھارا خیال آجاتا ہے ورنہ اکثر جی میں آتا ہے کہ گھر کو آگ لگا کر کسی غیر آباد جزیرے میں ایک "لوٹا" ڈور، فروٹ سالٹ اور دیوانِ غالب لے کر چلا جاؤں۔

عالم بیزاں میں ایک دن پاک بوہیمین کافی ہاؤس<sup>+</sup> میں ننھنوں کی چمینی سے

KING STORK کا ڈھواں خارج کرنے کے بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے اور

\* یہ گھر نو سو روپے کا تھا۔ اور جس فرنیچر سے آناستہ تھا اس کا سال بھر کا کرایہ چڑھا ہوا تھا۔

PAK BOHEMIAN COFFEE HOUSE<sup>+</sup> جہاں مرزا روزانہ شام کو لونڈا مار چائے



مٹھی بھینچ کر کہنے لگے:

”ماگر میں اس ملک کا پرائم منسٹر ہوتا تو۔۔۔۔۔“

”تو۔۔۔۔۔؟“ ہم نے پوچھا۔

”تو یونیورسٹی میں نوکری نہیں کرتا!“ انہوں نے مٹھی کھول دی۔

وہ پرائم منسٹر ضرور ہونا چاہتے تھے، مگر جس مقدار میں وہ ذہنی سکون اور فرصت

چاہتے تھے، وہ ہمارے ہاں صرف پرائمری اسکول کے ماسٹر کا حصہ ہے۔ ”فراغت و کتابے“

کا جہاں اتنا عمل دخل ہو تو آپ خود قیاس فرما سکتے ہیں کہ معلمی کا پیشہ چھڑوانے میں ہمیں

کیسے کیسے سبز باغ دکھانے پڑے ہوں گے۔ لیکن اس کا رثواب میں ہمیں زیادہ جھوٹ

نہیں بولنا پڑا، اس لیے کہ علم و ادب سے بیزار کرنے میں علمائے جامعہ نے ایسا موثر

کردار ادا کیا کہ پروفیسر کا دل اپنے کسب سے کھٹا ہو گیا۔ دورانِ رخصت خبر آئی کہ

یونیورسٹی نے ان کے ایک ”بونیئر“ کو ۱۸۵۷ء میں دلی کے سودا بیچنے والوں کی

آوازوں پر ریسرچ کرنے کے ساتھ سمندر پار لندن بھیجا ہے۔ پروفیسر نے اسی وقت ہمارے

بیٹے کی چار لائن والی کاپی پر استعفیٰ لکھ کر بیرنگ پوسٹ کر دیا اور اپنا نام تھیس چاکسو

(خورد) کا دبستانِ شاعری“ (جس کا موضوع ان شعراء کا کلام تھا، جن کی ولادت کہیں

اور ہونے کے بجائے چاکسو خورد میں ہو گئی تھی) پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس شخص کے

پندرہ سال تک اوصورے رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بعض ایسے شعراء جن پر وہ تبصرہ

کرنا چاہتے تھے، اُن کے انتقال میں ابھی خاصی دیر معلوم ہوتی تھی۔

تو یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب پروفیسر اپنی بوسیدہ کشتی جلا ہی نہیں چکے تھے

بلکہ اس کی راکھ سے تن پر بھرت رات راتے مور کھوں کے من کی آنکھیں کھولتے پھرتے تھے!



کلاس روم سے بنک تک پہنچنے میں پروفیسر کو کس صراطِ غیر مستقیم سے گزرنا پڑا، یہ ان کا دل جانتا ہے یا ہم۔ اس کا ذکر کسی نامناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ بنک میں انیسویں سے ان کے کندھوں کا پروفیسر انہ ختم تو دور نہ ہوا، مگر بہت سی اور خوشگوار نیلیاں کچھ از خود کچھ اوروں کے کہنے سننے سے ان کی شخصیت میں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اب تک ان کی شخصیت SELF-MADE (خود ساختہ) تھی۔ یعنی اس میں اُنھوں نے رزقی و صوبی، ڈاکٹر و رمانی کو اصلاح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ پروفیسری کے ابتدائی ایام میں جب لڑکے بالکل لڑکوں ہی کی سی حرکتیں کرنے لگے تو ہم سب نے صلوات دی کہ لب و لہجہ میں ڈپٹ اور شخصیت میں رعب و اب پیدا کرو۔ دوسرے ہی دن انھوں نے جوتوں میں لیون اینج موٹا لٹا لٹوایا اور اونچی باڑھ کی ٹوپی پہنی شروع کر دی، جس سے قد تو خیر کیا بڑھتا، البتہ خودی اتنی بلند ہو گئی کہ ہم نے انھیں بادشاہی مسجد کے دروازے سے بھی نکال کر رکھتے دیکھا۔ رانی زورِ خودی سے پرست بن چکی تھی۔ کردار بھی ان کا اپنا نہیں رہا تھا۔ شاہین کی خصلت اختیار کر لی تھی۔ یعنی بار بار اپنے موضوع اور مخاطب پر جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا

جھوٹ کیوں بولیں ہم نے کبھی شاہین نہیں دیکھا۔ اللہ جانے، اُس کے مونچھیں ہوتی ہیں یا نہیں۔ بہر حال انھوں نے رکھ لی تھیں جو برابر تاؤ دیتے دیتے گاک کھولنے کے اسکرپو جیسی بولتی تھیں۔ دائیں مونچھ ہمیشہ سفید رہتی تھی۔ اس لیے کہ بلیک بورڈ پر سفید چاک سے لکھتے تھے اسی چپکے سے دیتے رہتے تھے۔ اور یہ عادت اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ حالانکہ بنک پر اتنا کا خط ملتے ہی مونچھ کا صفایا کر دیا، لیکن بے چین چپکے سے مہینوں اُس جگہ جوتاؤ جتے رہتا جہاں کبھی مونچھ جوتا کرتی تھی۔ ان تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ لڑکوں نے



ان کے لیکچر کی فاش غلطیوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ اب ان کے حلیے پر ٹھٹھے لگاتے تھے۔  
تقرر کے تین مہینے بعد بینک نے پروفیسر کو تعلقات عامہ اور ایڈورٹائزنگ کی  
تربیت کے لیے چھ مہینے کے کورس پر پیرس بھیجنے کے احکام صادر کیے۔ اور یہ بھی پیش کش  
کی کہ اگر آپ اپنی بیگم کو ہمراہ لے جائیں تو ہمیں عین مسرت ہوگی۔ دونوں کے فرسٹ کلاس  
ٹکٹ اور ہوٹل کے جملہ اخراجات بینک کے ذمے ہوں گے۔ خط ملتے ہی دماغ میں شہنائیاں  
بجھنے لگیں۔ کراچی کی ان تمام خواتین کی، جن کے جملہ حقوق ہنوز غیر محفوظ تھے، ایک مکمل فہرست  
ہم سے بنوائی اور پھر سپر گئے کہ سر دست ان میں سے کسی ایک سے دو بول پڑھو اور مالہ ٹھٹ  
بیکار نہ جائے اور مہنی مون مفت پڑے۔ اگر مرزا نے ایک ہی فقرے سے ان کے ذہن  
کی ساری گرہیں نہ کھول دی ہوتیں تو خدا جلنے کب تک ہماری جان کو آتے رہتے۔ فرمایا  
”بیوی کو پیرس ڈھو کر لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایورسٹ سر کرنے کے لیے اور تمہارا  
میں گھر سے برف کی ڈلی رکھ کر لے جائے!“

پیرس (جسے اب وہ پیار میں ”پیری“ کہتے تھے) سے لوٹنے کو تو لوٹ آئے لیکن  
دماغ وہاں کے قہوہ خانوں اور دل قحبہ خانوں میں چھوڑ آئے۔ جسدِ خاکی کو پاکستان میں گھسیٹ  
پھر رہے تھے۔ سامنے نادہندوں کے بھی کھاتے کھلے پڑے ہیں، مگر آنکھوں میں ہی کتابی  
چہرے پھر رہے ہیں

کہ دکھیں جن کو یورپ میں توداں توداں سیپاڑ

ایک ایک سے پوچھتے تھے پاکستان میں انقلاب فرانس کب آئے گا؟ اس انقلاب کی  
پذیرائی کے لیے وہ اپنی پتلون کی ”کریر“ اسٹری کی دھار جینی بناتے رکھتے تھے۔ پرانی  
دفع کی غرارے ناپتلونوں کے پائینچے ان کی ہمیشہ نے گاؤں کیوں پر بطور خلاف پڑھائے



اور ان کی اونچی باڑھ کی ٹوپی سے ایک خوبصورت ٹی کوزی بنائی جسے اٹھاتے ہی ان کا سر یاد آتا تھا۔ پہلے اپنے والد ماجد کو بھی خط لکھتے تو آخر میں ”تا بعد از“ پر وفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ بی۔ ٹی، گولڈ میڈلسٹ“ لکھ کر گولڈ میڈلسٹ کے نیچے احتیاطاً خط کھینچ دیا کرتے تھے کہ بندہ بشر ہے، مبادا نظر چوک جاتے۔ لیکن اب کاغذ پہ کلیجہ نکال کے رکھ دینے کے بہانے بینکروں کے طرز پر دستخط کی جگہ ایک جلیبی سی بنا دیا کرتے تھے، جس کی نفی کلم از کلم کاغذ پر کوئی حلوائی بھی نہیں کر سکتا۔ کالرمیں دھوبی سے خاص طور پر کلف لگواتے۔ خود بھی انگریزی تلفظ میں خوب کلف لگانے لگے تھے۔ دلدر دور ہوتے ہی وقت کی پابندی بھی تکلیف دہ حد تک کرنے لگے۔ جب سے اندھیرے میں وقت بتانے والی قیمتی گھڑی خرید کر لاتے تھے، انھیں دن سے سخت الجھن ہونے لگی تھی۔ فرشی نشست کے بچپن سے عادی تھے۔ وہ ترک تو نہیں کی، لیکن اب گاؤں تکیے کا سہارا لے کر نہیں بیٹھتے تھے۔ اسے گود میں لے کر بیٹھتے تھے۔ مختصر یہ کہ ”پرسنیلٹی“ نکل آتی تھی۔ بیل گاڑی میں جیٹ لڑا کا بھوانی جہاز کا انجن لگ گیا تھا۔

”مدیر سہی“ نیا افق“، بعضوں نے یہ عصرانہ ترتیب دیا تھا، شعر کا عجب مذاق رکھتے ہیں۔ شعر کو غلط پڑھ کر اور غلط سمجھ کر بھی اس قدر لطف اندوز ہوتے ہیں کہ اچھے چھے صحیح سمجھنے والے انہیں جھانکتے رہ جاتے ہیں۔ روزمرہ بات چیت میں بھی خود کو راقم الحروف کہتے ہیں۔ جیسے ہی ہم ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ”نیا افق“ کے دفتر میں داخل ہوتے، مدیر موصوف نے ہمارے سلام کے جواب میں دو تین دفعہ اپنا ہاتھ بگلے کی گردن کی طرح موڑ کر ہمیں دکھایا جسے ہم نے بدتمیزی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مگر جو خوشی ہمارا سر چیت سے نکلا، ایا، ہماری سمجھ میں آگیا کہ رنجور صاحب نے جو ہاتھ کا بگلا بنا کر ہمیں چیرایا تھا تو وہ دراصل



سرگھٹنوں میں دے کر چلنے کا اشارہ تھا، کیونکہ دفتر کی چھت مشکل پانچ فٹ اونچی ہوگی۔  
وہ تو خدا بھلا کرے مرزا کا، اگر وہ ہماری گردن میں لٹک کر ہمیں فی الفور دہرا نہ کر دیتے  
تو ہمارا کاسہ سر اوپر چلتے ہوئے پنکھے سے کب کا بڑی صفائی سے ترش کر ان کے قدموں  
میں جاگرا ہوتا۔ اور ہم تو کیا، ہمارے سیمے کی رستم تک خرد برد ہو چکی ہوتی۔

سر اُتارنے کے علاوہ پنکھے کا نہمنی مصرف، بقول شخصے، گرم ہوا کو سارے کمرے  
میں بھجھڑ مسادی پھیلاتا تھا تاکہ کوئی حصہ محروم نہ رہ جاتے۔ جیسے ہی ہم سر اور تن کے  
نازک سے رشتے کی حفاظت کرتے ہوئے آگے بڑھے، مدیر سہی "نیا افق" نے اپنا  
بایاں ہاتھ مصافحہ کے لیے پیش کیا۔ ہم نے بھی اخلاقاً اپنا بایاں نکالا تو چاروں طرف سے  
کھئی کھئی کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے جھینپ کر جھٹ اسے دائیں جیب میں ٹھونسنے کی  
کوشش کی۔ پھر یاد نہیں، کونسی جیب میں سے اپنا دایاں کھینچ کر نکالا اور اسے ان کے  
بائیں سے بلوانے کی کوشش کی۔ کھئی کھئی۔ کھئی کھئی کی آوازیں ورتیز ہو گئیں۔ ٹپ کر انھوں نے  
اپنا ہاتھ چھڑایا اور دونوں ہاتھوں سے ہماری دائیں کلائی مروڑ کے مستحیلی کا رخ اپنی جانب  
کیا۔ پھر ہماری مستحیلی کو اپنی مستحیلی سے دو تین دفعہ خلوص سے رگڑا، جسے ہم ان حالات  
میں مصافحہ کہہ دیں تو مبالغہ نہ سمجھا جائے۔

در اصل بھول ہماری ہی تھی۔ اس لیے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ رنجور صاحب دو  
سال سے بائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنے لگے ہیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ بارہ سال  
سے وہ بائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لٹکاتے پھرتے تھے، جسے ازراہ انکسار بریف  
کیس کہتے تھے۔ اس میں بارہ سال کے سارے کزنوت، یعنی تمام خاص نمبر اور سگم  
کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوڑیاں بند رہتی تھیں۔ دونوں میں ایک وہ سرے کی بوبان



اس طرح رچ بس گئی تھی کہ شہرین کو "طوائف نمبر" کھول کر دکھاتے تو محسوس ہوتا گویا پانڈا  
 کھل گیا اور کبھی ورقِ نقرہ میں لپیٹی لکھنوی قوام اور سستی خوشبوؤں کے جھکے مارتی گلوری  
 کھلا دیتے تو لگتا کہ "طوائف کی پاپ بیتی" بلکہ خود اُسی کو چہا رہے ہیں۔ بریف کیس اٹھاتے  
 پھرنے سے اُن کا بایاں کندھا مستقلاً جھک گیا تھا۔ اور اب یہ زمبیل ہاتھ میں نہ ہوتا  
 بھی اُن کا بایاں ہاتھ گھٹنے کو چھوتا تھا۔ جب انھیں دُنیا نے ادب میں LEANING

TOWER OF PISA کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تو شروع شروع بہت اتراتے

پھرے۔ پھر ایک دن مرزا نے تخلیہ میں سمجھایا کہ اشارہ تمہارے سیاسی جھکاؤ کی طرف  
 نہیں ہے تو چونک پڑے، "اچھا! یہ بات ہے!" کندھوں کی بارہ سال پرانی کان کالنے  
 کے لیے مرزا نے یہ ورزش تجویز کی کہ آئندہ بارہ سال تک دوسرے ہاتھ سے اٹھاؤ۔ چنانچہ  
 انھوں نے بریف کیس دائیں ہاتھ میں منتقل کر دیا اور بائیں ہاتھ سے مصافحہ کی عادت اُلی  
 گلوری بھی اب بائیں کے بجائے دائیں کلتے میں رکھنے لگے تھے۔ یہ اُسی زمانے کا ذکر ہے۔  
 متذکرہ مصافحہ ہو چکا تو پروفیسر نے ہمارا تعارف کرایا کہ آپ سے ملیے۔ آپ

ہمارے ساتھ پانچویں جماعت میں دینیات کے پرچے میں نقل کر کے فیل ہوتے تھے۔ اس  
 وقت دوپہتی کے نیچے دس بارہ آدمی بیٹھے ہوں گے۔ حالانکہ کرسیاں دوہی نظر آرہی تھیں۔  
 ایک کی ٹانگیں شرابی جیدی تھیں۔ اس پر میزبان یعنی مدیر "نیا افق" لڑکھڑاہے تھے دوسری  
 کی نشست اور پاؤں کا گھٹنا ہوا جھٹہ چھ چھ انچ کاٹ دیا گیا تھا۔ اس پٹری پر مہمانِ خصوصی  
 گنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ ان کی ٹھوڑی میز پر اس طرح دھری تھی جیسے میلوں اور قصبائی  
 نمائشوں کے جادوگر میں مداری کے جھمورے کا کڑا ہوا سر رکھا رہتا ہے۔ سلسلے "نیا افق"  
 کی ناقابلِ فروخت کاپیوں کے بنڈل دیوار کے ساتھ بڑے قرینے سے چنے ہوئے تھے۔



ان پر رسالے کے قلمی معاونین بھلتے گئے تھے۔ یہ نہیں کہ میزبان کو اپنے عزیز مسلمانوں کی بے آرامی کا احساس نہ تھا۔ ہر آنے والے کی آؤ بھگت وہ اس طرح کرتے کہ جھپاکتے اپنے نیچے سے روٹی کی گدھی نکال کر اسے پیش کرتے۔ اور بھی آپ! انہیں آپ! اس صاحب! کیوں کا ٹور میں گھسیٹے ہیں؟ کی پر تکلف نگار کے بعد اسے واپس اپنی ہی کرسی پر جھک دیتے کہ موخر الذکر میں ایک سوراخ تھا، جس میں سے دو فٹ بال بغیر ڈھکے کرز سکتے تھے۔ دروازے کی بائیں جانب میں رنگیلستے کنستروں پر دفتر کا سامان پورڈ رکھ کر بچا ہوا صوفہ بنا دیا گیا تھا۔ نشست نقادوں کے لیے مخصوص تھی۔ ہمیں ناقابل اشاعت فحش افسانوں کے ایک پلندے پر بٹھایا گیا جن کی گرمی بھی ٹھیک سے نہیں چلی تھی۔ ملحقہ کمرے سے ہر عمر کے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دفتر کی دیواریں بیک کر نیال ہوتا تھا کہ یہاں سلیٹ کا رواج نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد انہی میں کا ایک بچہ ایلو منسیم کا جگ لے کر آیا اور مشرڈب مشرق یعنی خالص پانی کا دور چلا۔ پانی واقعی نہایت شفاف تھا۔ اتنا شفاف کہ گلاس کا گند اپنیدا صاف نظر آ رہا تھا۔ ذرا دیر میں سب چھک گئے تو پانی پیش کیے گئے، جنہیں اس دفعہ گلدی کہنے میں اس لیے مائل ہے کہ وہ اتنے ننھے مٹے تھے کہ چھالیا کے دانے ان میں سما نہیں سکتے تھے۔ لہذا چھالیا الگ سے پیش کی گئی۔ ہاں تمباکوہ وافر مقدار میں تھا۔ جس کا جتنا جی چاہے کھالے۔

ان تکلفات کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ چار نامور نقادوں نے

پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے بی۔ ٹی (گولڈ میڈلسٹ) کے مضمون

”موازنہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ و شیخ امام بخش ناسخ“

پر مقالے پڑھے۔ یوں تو یہ مضمون پروفیسر موصوف نے پچیس سال پہلے اپنے زمانہ طالب علمی



میں سپردِ قلم کیا تھا، مگر نقادوں نے اس پر بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی تھی۔  
 اخیر میں مرزا عبدالودود بیگ نے خطبہ اعتدال میں پڑھ کر حق دوستی ادا کیا۔ انھوں  
 نے ”بنک آف چاکسو ادبی انعام“ کی ایک انقلابی تجویز بھی پیش کی۔ تجویز یہ تھی کہ کچھ  
 قلم کے دھنی ایسے ہیں جو اگر لکھنے سے باز آجائیں تو اُردو پر بڑا احسان ہوگا۔ بنک آف  
 چاکسو پرائز انہی محسنوں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس بات کی پوری چھان بین  
 کرنے کے بعد کہ کس مصنف نے سال بھر واقعی کچھ نہیں لکھا ہے، حج سالانہ پھسلاوے  
 کا اعلان کریں گے۔ انعام یافتہ مصنف اگر پرورش لوح و قلم سے سیدھی طرح باز آ  
 جائے تو ”لائف ٹیشن“ کا حقدار ہوگا جو بشرطِ نیک چلنی اسے ماہِ باہ ملتی رہے گی۔ اگر  
 بروقت موت واقع ہو جائے تو بیوہ کے لیے معقول وظیفہ بھی مقرر کیا جائے گا بشرطیکہ  
 وہ تمام غیر مطبوعہ تخلیقات جو مرحوم چوری چھپے کرتے رہے، ان کے ساتھ ہی دفن کر دی  
 جائیں۔

اس پر ہم نے زور زور سے تالیاں اور پاس والا کنستری بجایا۔ اور اللہ جلنے،  
 کب تک بجاتے رہتے اگر مرزا ایکایک یہ اعلان نہ کر دیتے کہ اس سلسلہ کے پہلے  
 انعام کا مستحق سارے پاکستان میں ہم (یعنی راقم السطور) سے زیادہ اور کوئی نہیں!  
 ہماری یہ دُرگت ہفتے میں چار پانچ دفعہ ضرور غبٹی بھٹی۔ اس لیے کہ ہفتے میں  
 چار پانچ دفعہ پروفیسر کے اعزاز میں کہیں نہ کہیں استقبالیہ ہوتا تھا، جہاں پہلی صف  
 میں مالی بجاتے ہوئے فوٹر کھینچوانے کے فرائض ہمارے ذمے ہوتے تھے۔ (مرزا  
 کہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی تقریر کے بعد تمھاری مالی بالکل الگ سنائی دیتی ہے) دفتر  
 میں اپنی مصروفیت کے بارے میں دن بھر باتیں کر کر کے پروفیسر خود کو بُری طرح تھکا



لیتے تھے۔ ایک عمر نسکی و نا کامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اب وہ جہاں نظر آتے، گھٹے  
کے مار پھرنے، افتخار سے لے کر ہتے نظر آتے۔ یہاں تک سنبھلے ہیں کیا کہ ان تمام ضیافتوں  
کا خرچ پروفیسر خود اٹھاتے ہیں۔ صرف ایک استقبالیہ کا بار انھوں نے نہیں اٹھایا۔  
اس کا مفصل حال ہم آپ کو سنایا ہے۔ سات آٹھ مہینے تک تو ان کے تقریر کی خوشبو  
انہوں میں ہوتی رہی۔ اور اس کے بعد غالباً اس خوشی میں کہ وہ ابھی تک برخواست  
نہیں ہوئے تھے۔ جو یہ رہا تھا کہ سستے اور فلی رسلے بنک کے اشتہار کی گھات  
میں رہتے اور موقع پلانے ہی (جو پروفیسر مستقل فراہم کرتے رہتے تھے) نپاٹا دار کر  
بولتے۔ یعنی پروفیسر کا موازنہ ٹی۔ ایس۔ ایلٹ و شیخ امام بخش ناسخ، جس میں انھوں  
نے مولے کو شہباز سے لڑایا تھا، من و عن چھاپ دیتے۔ پروفیسر غریب اب ”موازنہ“  
کو جتنا دباؤ اور چھپاؤ چاہتے، رسلے اتنا ہی اسے اچھالتے۔ گویا مصنف کو اسی کی تحریک  
سے بلیک میل کر رہے تھے۔ پروفیسر کو شہر کے ایک ایک سٹال سے ایسے  
شماروں کی تمام کاپیاں بنک کے خرچ پر خرید کر جلائی پڑتیں تاکہ لوگ ”موازنہ“ نہ پڑھ  
پاتیں۔ اب وہ اپنے گڑے مردے کو اکھڑا کر روح پھنکواتے پھنکواتے عاجز آچکے۔  
تھے۔ مجبوراً ”موازنہ“ کی جگہ بنک آف پاکستان کے بارہ اشتہار بنک کر کے ایڈیٹر کے  
منہ پر ایک سال کے لیے طلائی قفل لگا دیتے۔

پروفیسر کو ان کے ماضی کے بلبے سے کھینچ کر نکالنے کا سہرا مرزا کے سر ہے۔  
کی ذہنی آباد کاری میں جو دشواریاں پیش آئیں، ان کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں  
کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر کو نیک و بد کی تمیز ضرور تھی۔ اور اگر قوتِ باہر  
فرانس کی شہین سے متاثر نہ ہو تو سیاہ و سفید میں بھی امتیاز کر سکتے تھے بشرطیکہ ان



زنگوں کا تعلق نسوانی جلد سے ہو۔ مگر چھوٹے بڑے بیوپاری کی پہچان؟ یہ سوال انہیں ہمیشہ نصاب سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ کسی کا ”بنک بیلنس“ ہاتھ پر تو لکھا ہوتا نہیں، چنانچہ ایک دو مہینے تک یہ رویہ رہا کہ اگر کوئی شخص میلا مسلا کرتا یا جامہ پہنے، خط بڑھا، انگوٹھے اور کلمے کی انگلی سے باچھوں کی پیک پونچھتا بغیر کارڈ بھیجے کمرے میں منہ اٹھاتے چلا آتا تو اسے دھکے دے کر تو نہ نکالتے مگر اس طرح پیش آتے کہ اس زحمت کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ غلط اُردو بولنے والوں کو چلتے تک کے لیے نہ ٹوکتے لیکن جب پہلی ہی بورڈ میٹنگ میں انہی میں کے چار اشخاص کو ڈائریکٹروں کی سُنج مٹلی کیسیوں پر متکتن دیکھا (جن سے اپنے کمرے میں اُنھوں نے ہاتھ بھی نہیں بلایا تھا) تاکہ بعد میں رگڑ رگڑ کر نہ دھونا پڑے) تو اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور چار ہندسے والی تنخواہ خطرے میں نظر آنے لگی۔ پھر تو دل میں ایسا ہول بیٹھا کہ سڑک پر کوئی بھی میلے کچیلے کپڑوں میں نظر آجاتا تو فوراً سلام کر لیتے تھے۔

پروفیسر کی بوکھلاہٹ سے ان کی عظیم ذمہ داریوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اور ان عظیم صلاحیتوں کا بھی جن کے بغیر وہ بخوبی گزارہ کر رہے تھے۔ حواس مختل، زبان کھچڑی، لب و لہجہ اکھڑا اکھڑا۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ غور تو فرمائیے۔ ابھی ملتان کے سوداگر چرم و پشم کے ساتھ اس پر شرط بدی جا رہی ہے کہ حاجیوں کے پہلے جہاز کی واپسی پر تیزیابی سونے کا بھاؤ کتنا گرے گا۔ اور اب FANNY HILL کے دورانِ خون کو تیز کرنے والے اقسامات میز کی درازہ سے نکال کر سناتے جانے لگے۔ پانچ منٹ پہلے ایک اشتہار کے طلب کار سے ہاتھ پاتے ہوتے رہ گئی کہ اُس نے منہ بھر کر یوں کہہ دیا تھا کہ آپ ہر پھر کے اندھوں ہی کو ریوڑی بانٹتے ہیں۔ اور اب یہ مسئلہ



زیر بحث ہے کہ پانی کے دریاؤں\* سے جو نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا ہے اُس سے  
 بنکوں کی شرح سود اور اُردو ربا عی پر کیا اثر پڑے گا۔ ایک ریسپور یہ کہہ کر رکھ دیا کہ  
 ”ذرا ایک منٹ توقف فرمائیے۔ میں ہانگ کانگ ڈالر کا بھاؤ ابھی معلوم کر کے بتاتا  
 ہوں۔“ دوسرے فون پر یکبارگی اپنا گیت تبدیل کر کہنے لگے ”واہ! واہ! کیا پھڑکتا ہوا مصرع  
 نکلا ہے! ذرا پانچ منٹ بعد دوسرا بھی مرحمت فرمائیے گا۔“ مگر مصرع ثانی والی گھنٹی پانچ  
 کے بجائے دو منٹ بعد ہی بجنے لگی ”ہیلو! ہیلو! واللہ! کیا تیور ہیں! بالکل مومن  
 کا سا انداز ہے! ہاتیں؟ کیا کہا؟ مومن ہی کا شعر ہے!! لا حول ولا قوۃ! میں تو سمجھا  
 آپ کا ہے! مگر مومن کی بھی کیا بات ہے! کبھی کبھی ظالم بالکل آپ ہی کے انداز  
 میں شعر کہ جاتا ہے!“

کاروباری دنیا میں بالعموم شعر و شاعری کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر پروفیسر نے  
 نکال لی تھی۔ مہینوں تک یہ حال رہا کہ ہر دو جملوں کے بعد ایک شعر جھاڑ دیتے تھے۔ اور  
 یہ جملے بھی دراصل شعر ہی کی تمہید یا تعریف میں ہوتے تھے۔ ورنہ انہیں چھوٹ دے  
 دی جاتی تو بنکاری کے پچیدہ سے پچیدہ مسئلہ کا دو ٹوک فیصلہ دیوان حافظ سے فال نکال کے  
 کر سکتے تھے۔ مرزا ایک دفعہ ان سے ملنے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ فارسیکا کی ہلال نامیز کے  
 گرد خوش گلو و خوش خوراک شعراء اشیائے خوردنی کے ساتھ انصاف فرما رہے ہیں۔ اور  
 بنک میں دن دھاڑے مشاعرہ ٹوٹ رہے ہیں۔ ٹیلی فون کا ریسپور اتار کر شاعر کے سامنے  
 رکھ دیا گیا ہے تاکہ مشاعرے کی کارروائی صبحے تک ”ریلے“ کی جاسکے جو چار میل دور  
 \* اس زمانے میں قرۃ العین حیدر کے ناول ”آگ کا دریا“ کا نام لوگوں کی زبان پر اس قدر چڑھا  
 ہوا تھا کہ جب بھی اصلی دریا کا ذکر ہوتا تو پروفیسر موصوف ابہام سے بچنے کے لیے پانی کا دریا کہتے تھے۔



صدر میں اپنی کتابوں کی دکان میں ڈیڑھ گھنٹے سے باتیں ہاتھ میں فون لے بیٹھے ہیں اور  
دائیں ہاتھ سے گاہکوں کو اس وقت کتابیں خریدنے سے منع کر رہے ہیں۔ شاعر کو کبھی بھی  
ریسیور کان سے لگا کر بجنے کی دوائسوا دی جاتی ہے اور وہ اٹھ اٹھ کر لکھنوا انداز سے  
فون کو آداب بجا لاتا ہے۔

مرزا غریب تو کسی کام سے گئے تھے۔ لیکن دروازے کی درز میں سے جھانک  
کر یہ نقشہ دیکھا تو سرکاری کام کو ان کی تفریح میں خارج پا کر اُٹے پاؤں لوٹ آئے۔  
شعر و شاعری سے مرزا کی طبع ناموزوں یوں بھی ابا کرتی ہے۔ اور مشاعروں سے تو وہ کوسوں  
دور بھاگتے ہیں۔ خصوصاً بڑے مشاعروں سے۔ کہتے ہیں ”صاحب! جو شعر بیک وقت  
پانچ چھ ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آجائے، وہ شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ضرور کچھ نہ کچھ  
کھوٹ نکلے گا۔“ مرزا نے جب دیکھا کہ پروفیسر کو نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں  
بڑی دشواری ہونے لگی ہے تو سمجھانے بیٹھ گئے ”پروفیسر! یہ ساہوکارہ سنسا رہے۔ صحیح  
اردو سے گجراتی سیٹھ بے حد رعب کھاتا ہے، مگر سودا بگڑ جاتا ہے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ  
دو سیٹھ مختلف اوقات میں تمہارے بنک میں اکاؤنٹ کھولنے آتے۔ لیکن ایک مہینہ کو  
تو تمہاری سکرٹری نے گھسنے نہیں دیا۔ اور دوسرے چنیوٹی بیوپاری نے، جو رقم جمع کرانے  
آیا تھا، تمہیں بنک میں دیکھ کر فوراً ارادہ بدل دیا اور اپنی جمع جھٹا ٹوپی میں چھپا کے کہنے  
لگا کہ میں تو دراصل اوور ڈرافٹ لینے آیا تھا۔ کمال یہ کہ تم نے واقعی اسے اوور ڈرافٹ  
دلوادیا، جس سے اُس نے اُسی وقت دوسرے بنک میں جا کر اکاؤنٹ کھول دیا اور یہ  
اہل درد کو پیساریوں نے لوٹ لیا۔“

مرزا انہیں شعر سنانے سے باز رکھ سکتے تھے، لیکن شعر سننے پر کیسے پابندی لگائی



جاسکتی تھی۔ پروفیسر سامنے بیٹھے ہوئے شاعر کا مصرع اٹھانے سے انکار کر سکتے تھے، لیکن اُن کا منہ کیسے بند کرتے جو فرصت گفتگو غنیمت جان کر فون پر ہی خون تھوکنے لگتے تھے۔ ایک دن پروفیسر بڑی طرح بوکھلائے ہوئے تھے، کیونکہ آدھ گھنٹے بعد بورڈ آف ڈائریکٹرز کا اجلاس تھا، جس میں بینک کا سپلٹی بجٹ برائے توثیق و کالی گلوچ پیش ہونے والا تھا۔ ان کی صورت ایسی ہو رہی تھی جیسی اشتہاروں میں اُن لوگوں کی ہوتی ہے جن کو ”ہارلیکس“ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میز پر کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا۔ کمرے کے باہر لال بٹی روشن تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ آج وہ وہی تباہی آدمیوں یعنی اپنے خاص دوستوں سے ملاقات نہیں کریں گے۔

اتنے میں سفید ٹیلی فون کی بیٹھی بیٹھی آواز والی گھنٹی بجی اور دوسرے سرے سے گودام کیپر کی اسامی کے ایک اُمیدوار حضرت مدہوش مادھو پوری نے اپنے تخلص جیسے رقم میں اپنی نو تصنیف مستس سنانی شروع کی۔ ہر چند کہ یہ توڑ کا وقت تھا اور پروفیسر کو سگر کی راکھ جھاڑنے تک کی فرصت نہ تھی، لیکن مستس کے ابتدائی بند انہی کی مدح میں تھے اور اللہ غنی! اس میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا تھا کہ فون بند کرنے کو کسی طرح جی نہ چاہا۔ خدا جانے کب کا لیا دیا آرٹے آگیا کہ بیس منٹ بعد فون خود بخود غراب ہو گیا اور پروفیسر اپنی نیلی ’بوڈ ٹھیک کرتے ہوئے بورڈ روم کی طرف بھاگے۔ اجلاس ایکٹ

☆ سفید ٹیلی فون — یہ ان کا پرائیوٹ وہی۔ آئی۔ پی نمبر تھا۔ جو ڈائریکٹری میں درج نہیں ہوتا تھا اور جو صرف انتہائی اہم یا انتہائی بیہودہ گفتگو کے لیے مخصوص تھا۔ درمیانہ موضوعات سے معمولی نیلی فون پرنٹ لیتے تھے۔ اندرون دفتر برا بھلا کہنے کے لیے سمرتی اور سننے کے لیے سیاہ آلہ استعمال کرتے تھے۔



بچے ختم ہو گیا مگر فون سنٹ مٹ گیا غراب!۔ پروفیسر نے قصداً اسے ٹیک نہیں کرایا، اس لیے کہ وہ اپنی سکرٹری کو کیسٹونی کے ساتھ میننگ کی کارروائی لکھوانا چاہتے تھے۔ ٹیلیفون آپریٹر نے بھی فون ہلانے بند کر دیے اور چند گھنٹے عافیت سے گزرتے وہ کارروائی لکھوانا ہی رہے تھے کہ یکایک سفید فون کی گھنٹی آپ ہی آپ بجنے لگی۔ وہ اچھل کر اپنی سکرٹری کی گود میں جا پڑے اور دیر تک وہیں بے سدھ پڑے رہے۔ اسی عالم میں اس کے چٹکی لے کر دیکھا کہ جاگ رہا ہوں یا خواب میں ہوں۔ جب اُس نے پٹاخ سے گالی دی تو انھیں یقین آیا کہ خواب نہیں ہے! ریسپور اٹھا کر بولے ”ہیلو! کاضی عبدال کڈس ہیر! ہیلو! ہیلو! کاضی دس سائیڈ!“ ادھر سے آواز آئی ”جی! بجا فرایا! مگر میں تو مدہوش مادھو پوری عرض کر رہا ہوں۔ واللہ! صبح دس بجے سے آپ کا فون درست کرانے میں لگا ہوا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ دس بجہ شکایت نوٹ کرائی ہوگی۔ آخر جھک مار کر خود ٹیلی فون اکیسچینج کیا اور ایک ایک کی خبر لے ڈالی۔ جب کہیں جا کر پانچ بجے آپ کی گھنٹی بجی ہے۔ جی! تو عرض کیا ہے۔“

اور وہ چھ بجے تک عرض کرتے رہے!

کوئی دن خالی جاتا ہوگا کہ خفت و آشفہ خاطر کی کوئی نئی صورت پیدا نہ ہو۔ ایک دن (غالباً پیر کا دن تھا، جسے مرزا یوم سیاہ کہتے ہیں۔ اکثر پیش گوئی کرتے ہیں کہ دیکھ لینا، قیامت پیر ہی کے دن آئے گی) بینک میں اداس بیٹھے اپنے مخصوص انداز سے — یعنی پیالی ہونٹوں سے لگاتے وقت چھنگلیا اٹھاتے ہوتے — فرنج کافی پی رہے تھے۔ حسبِ عادت زور سے آنکھیں مسکیر رکھتی تھیں، حالانکہ اس وقت روئے تاباں کے گرد سگرٹ کے دھوئیں کا ہالہ نہیں تھا۔ کافی کے ہر گھونٹ کے بعد بائیں



ہاتھ سے اس خیالی دھوئیں کو ہٹاتے جاتے تھے تاکہ میچ مچی آنکھوں میں نہ گھسنے پائے۔ اتنے میں رسالہ ”مینا بازار“ کی ایڈیٹر آنکلیں۔ پروفیسر نے کہا کہ آپ پچیس سال سے بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں! بہت خوش ہوتیں۔ حالانکہ پروفیسر کا مطلب دراصل یہ تھا کہ جیسی بد صورت آپ پچیس سال پہلے تھیں، ویسی ہی اب بھی ہیں۔ محترمہ نے ”مینا بازار“ کا تازہ شمارہ پیش کیا۔ پروفیسر سر ورق پر کسی ایکٹرس کے بجائے اپنی تصویر دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ تصویر بالکل ان سے ملتی تھی۔ بہتر نہ تھی۔

”مینا بازار“ میں اشتہار نکلتا تھا کہ تمام زمانہ رسالوں نے یلغار کر دی اور پروفیسر سوچتے ہی رہ گئے

کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

مدیر ”آئینل“ سے جو تاریخی مچھٹا ہوا، اُس کے مکالمے پاک بوہیمین کافی ہاؤس کے بیروں تک کو ازبر ہیں۔ پروفیسر کو مدیر موصوف سے پہلی نظر میں نفرت ہو گئی۔ وہ تو خیریت گزری، ورنہ پروفیسر کا سینہ اگر ۳۴ انچ کے بجائے ۴۳ انچ ہوتا تو پہلی ہی ملاقات میں اُن کا لٹھو\* بنا ڈالتے۔ یہ رسالہ پینتیس سال سے اُنہی خواتین کی خدمت کیے جا رہا تھا جو اُس وقت پینتیس سال کی تھیں جب رسالے کا پہلا شمارہ نکلا تھا۔ قصہ کہانی کی اوٹ میں یہی شریف بیبیاں اپنی ہم عمر بیبیوں کو مزید شریف رہنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ رسالہ ایسے عریاں افسانوں سے یکسر پاک تھا جن سے ہر شخص لبت\* لٹھو بنانا۔ ایسی مار مارنا کہ اپنے بھی صورت نہ پہچان سکیں، جیسا کہ اردو لٹھو

کی چھپائی میں ہوتا ہے۔



بدذوقی محفوظ ہو سکے۔ جنسی کہانیوں کے بجائے رسالے میں کنواریوں بالیوں کو پلنگ کی کوری چادر پر کر دشنے سے ”نوش آمدید“ کاڑھنے کی ترکیبیں سکھائی جاتی تھیں۔ ادبی مزاج اتنا بدل چکا تھا کہ جو شاعر ۲۵ برس پہلے دُنیا کو مایا کا جال سمجھتے تھے، وہ اب اسے سرمایہ کا جال کہنے لگے تھے۔ لیکن ”آپنل“ کے لکھنے والے آج بھی عورتوں کو مستورا کہتے اور ماحول پر لا حول بھیجتے ہیں۔ نئی تراش کی چولی میں ان بزرگوں کو قرب قیامت کے آثار دکھلائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے مرزا عبدالودود بیگ تو اُلٹی تمنا کرتے ہیں کہ صاحب! قرب قیامت کی سچ مچ یہی نشانیاں ہیں تو پھر جلدی سے سورج سوانیز پہ آجاتے کہ زندگانی کا کچھ بھروسا نہیں۔ اور صاحب!

زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

موصوف نے آتے ہی فرمائش کی کہ ”موازنہ“ کی ٹکڑ کی کوئی چیز ”آپنل“ کے لیے عطا ہو۔ پروفیسر نے انھیں مطلع کیا کہ عدیم الفرستی کے سبب وہ گزشتہ پچیس سال سے کچھ نہیں لکھ سکے۔ سلام روستائی کے بعد غرض خاص کا اظہار ہوا: اشتہار چلتی ہے۔ پروفیسر نے عذر کیا، سالانہ بجٹ ختم ہو چکا ہے۔ فرمایا ”چلیے، کوئی مضائقہ نہیں۔ بینک کے ریٹسروں اور فارمولوں کا سالانہ آرڈر ہی آپنل پریس کو عنایت فرمائیے۔“ پروفیسر نے جواب دیا ”مگر سات لاکھ روپے کی اسٹیشنری آپ ایک ٹریڈل مشین پر دس برس میں بھی نہیں چھاپ سکیں گے۔“ ارشاد ہوا ”تو پھر بینک سے پچاس ہزار کا ’کلیں اور ڈرافٹ‘ ہی دلواد دیجیے۔“

پروفیسر کے صبر کا مختصر سا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دفتری ضبط و احتیاط کو بالائے طاقت رکھتے ہوئے فرمایا ”آپ کے مطالبوں کی ترتیب بالکل اُلٹی ہے۔ بخدا! بالکل اُلٹی! اپنا



تو یہ تھا کہ پہلے آپ پچاس ہزار قرض مانگتے۔ اس کے بعد اسٹیشنری کے آرڈر کی فرمائش کرتے۔ یہ بھی نہیں ملتا تو اشتہار مانگتے۔ پھر بھی میں انکار کرتا تو مضمون طلب کرتے۔ پھر میری ہمت نہیں ہوتی کہ انکار کرتا۔ شرمناک مضمون تو دے ہی دیتا۔

بولے ”ارے صاحب! یہی تو مجھے بھی اندیشہ تھا!“

بچوں کے رسالے ہمیشہ سے نگاہ التفات سے محروم تھے۔ آخر یہ کفر اس طرح ٹوٹا کہ رسالہ ”بازیچہ اطفال“ نے ایک ضخیم ”اشتہار نمبر“ نکالنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد یہ رسالہ بھی بنک کے اشتہارات سے نوازا جانے لگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ ”اشتہار نمبر“ پر ریحہ گئے یا اس کی مدیرہ آنسہ سمنٹا فرزدق کی تیغ ابرو سے برضا و رغبت ڈھیر ہوئے۔ سفید شلوار، سفید قمیض، سفید دوپٹہ، سیدھی مانگ، ننگے ہاتھ، ننگے کان۔ ہمیں تو وہ کسی طرف سے ایسی نہیں لگتی تھیں کہ آدمی کے پانچوں حواس پر ڈاکہ ڈال سکیں یا پہلی ہی ملاقات میں پروفیسر کے قلعہ ایمان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ لیکن یاد رہے کہ پروفیسر کنوارے تھے۔ چالیس سال کے تھے۔ اور حالیہ مردم شماری میں اپنا شمار مردوں میں کروا چکے تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہیر و نہ آج تک کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جس کو وہ ناپسند کر سکے۔ کنارے کو ترسا ہوا مانجھی ہر اٹھلی کھاڑی میں لنگر ڈال دیتا ہے۔ آنسہ سمنٹا نے آتے ہی شرہ سنایا کہ انھوں نے ”موازنہ“ کو بچوں کے لیے آسان اردو میں منتقل کیا ہے۔ ہاں عنوان میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی ہے۔ یعنی شیخ امام بخش ناسخ کے بجائے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کو بھڑا دیا ہے۔ البتہ اشعار وہی رہنے دیے ہیں تاکہ مضمون کی اصل شان برقرار رہے۔ اب موصوفہ اس مقالہ کے ساتھ مصنف سے انٹرویو کی روداد مع تازہ تصویر شائع کرنا چاہتی تھیں



اور اس سلسلے میں پروفیسر کو اپنے ہاں سنیچر کو چلتے پر مدعو کرنے آتی تھیں پروفیسر نے بہتیرا غدر کیا کہ سنیچر کی شام کو مجھے بہت کام ہے۔ تین کا کاک ٹیل پارٹیوں میں یکے بعد دیگرے شرکت کرنی ہے۔ لیکن وہ نہ مانیں۔ پیہم انکار سے اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پروفیسر کو عورت کے آنسوؤں کی ذرا سہار نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عورت کی کسی چیز کی سہار نہیں!

چنانچہ طے یہ پایا کہ پروفیسر تینوں کاک ٹیل پارٹیاں شتم شتم بھگتا کر سارے سات بجے تک اُن کے گھر پہنچ جائیں گے۔

پروفیسر کا اپنا بیان تھا کہ اُنھوں نے تینوں کاک ٹیل پارٹیوں میں اپنے پڑھنے کو فرائض کی انجام دہی میں ”اپنی طرف سے تو کوتاہی میں کوئی کمی نہیں کی“؛ مرزا کے کندھے پر اپنا سارا بوجھ ڈالے، وہ جم خانہ سے خمخانہ بکف و ججخانہ بدوش آنسو سمنٹا کے ہاں چائے نوش فرما لے پینچے تو دس کا عمل ہو گا۔ جس وقت وہ اپنی تیس ہاتھ لمبی کیڈ لک سے اترے ہیں تو مرزا کے بیان کے مطابق ان کا دایاں پاؤں اُس جگہ پڑ رہا تھا جہاں بال پڑنا چاہیے تھا۔ اور جن حروف کی آوازیں ہاشم کے منہ سے نکلتی ہیں، وہ ان کی ناک سے آسانی نکل رہی تھیں۔ گیلری سے گزرتے وقت اُنھوں نے ایک گرتی ہوئی دیوار کو اپنی پیٹھ سے سہارا دینے کی کوشش بھی کی۔ پھر انٹرویو شروع ہوا اور ٹیپ ریکارڈر چلنے لگا۔ مس سمنٹا نے چند رسمی سوالات کے بعد پوچھا کہ آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔ کس قسم کی بیوی اپنے لیے پسند کریں گے؟ پروفیسر نے جھومتے ہوئے فرمایا کہ مجھے روشن خیال بیوی بہت پسند ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی دوسرے کی ہو! موصوفہ نے پلو منہ میں ٹھونکتے ہوئے سن پیدائش پوچھا تو پروفیسر نے ۲۴۱۹ بتایا اور وضاحت



A. D. (بعد مسیح) بھی کہا تا کہ سُسنے والے کو مغالطہ نہ ہو۔ موصوفہ نے چندرا کر کہا، مگر آپ تو شکل سے صرف چالیس سال کے لگتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ پروفیسر نے جواب دیا کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں چالیس ہی سال کا ہوں! پھر دوسری وجہ کی تشریح و تشہیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ناول نگار جارج مورسے کسی صحافی نے دریافت کیا کہ آپ اسی سال کی عمر میں بھی سُرخ و سپید رکھتے ہیں، اس کا کیا راز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے شراب، سگریٹ اور سکیں کو قطعی ہاتھ نہیں لگایا۔ تا وقتیکہ میں گیارہ سال کا نہ ہو گیا!

ہمارے ایک طرفہ بیان سے یہ نہ سمجھا جاتے کہ پروفیسر ترنگ میں اپنی ہی خوبیاں ذہن نشین کراتے رہے۔ ان کی نظر دوسروں پر بھی تھی۔ مثلاً انھوں نے موصوفہ کی توجہ ایک ایسی خوبی کی طرف مبذول کرائی، جس سے وہ بالکل بے خبر معلوم ہوتی تھیں۔ آپ کی پسند کا سوال آیا تو پروفیسر نے:

موتیا، مصحفی، سنیچر کی شام، ہنری بلر، مہاوٹ، دال بھرے گرم پراٹھے  
ریشمی دولائی، نیگرو دوشیزہ  
کا ذکر کرتے کرتے

”بھتی! آپ کا دایاں کان سچ مچ بہت خوب صورت ہے!“

ایسے سوکھے سے منہ سے کہا کہ موصوفہ کے بائیں کان کو یقین نہیں آیا کہ ان کا دایاں کان کیا سن گیا۔ مرزا کہتے ہیں کہ سمنٹا فرزدق کے دونوں کانوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں تھا، لیکن پروفیسر نے دائیں کی تخصیص غالباً از راہ احتیاط کی تھی، اس لیے کہ اس وقت انھیں صرف دایاں کان ہی نظر آ رہا تھا۔ بہر حال یہ جملہ بھی ریکارڈ ہو گیا اور اس کے ساتھ وہ



ہچکیاں بھی جو ہر لفظ کے بعد ان کی سوانح خمیری میں ”فل اسٹاپ“ لگا رہی تھیں۔ پروفیسر نے جب تیسری دفعہ یہ کلمات تحسین ممدوحہ کے کان میں اُنڈیلے تو اُنھوں نے ٹیپ ریکارڈر آہستہ سے ”سوچ آف“ کر دیا۔ اور سفید دوپٹہ اپنے سر پر اس طرح لپیٹ لیا جیسے پرہیزگار بیبیاں نماز پڑھتے وقت لپیٹ لیتی ہیں۔ جیسے ہی وہ چائے لینے اندر گئیں تو مرزا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے

”ان کا دایاں واقعی بہت خوبصورت ہے۔“

بیچ میں مرزا نے دو تین دفعہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُٹھنے کا اشارہ کیا تو پروفیسر نے اس طرح ہاتھ گھمایا جیسے چکی پیس رہے ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ وہیں مرزا کا ہتھو بندیا دیں گے۔

وہ میز پر پڑے رکھنے کے لیے جھکیں تو دوپٹہ ڈھلک کر گلے میں آگیا اور پروفیسر نے چپکے سے دائیں کان میں وہی جملہ دہرا دیا۔ اب کی دفعہ جو موصوفہ نے ڈھاٹا باندھا تو آخر تک نہیں کھولا۔ خدا خدا کر کے پونے بارہ بجے انٹر دیو اپنے اختتام کو اس طرح پہنچا کہ پروفیسر کو بیچ محلے کے زیند آگئی۔ مرزا نے منہ پر پانی کے چھپکے دے کر جگایا۔ موصوفہ چند منٹ بعد موصوف کو کار میں سوار کرانے باہر تشریف لائیں۔ وقت شخصیت آداب بجالانے کے لیے اُنھوں نے اپنی صراحی دار گردن خم کی تو دوپٹہ کا اینڈوا پھر سینے پر آ رہا اور پروفیسر نے جواب میں انگشت شہادت اٹھاتے ہوئے فرمایا

”آداب! اور بایاں بھی۔“

اور وہ جھینپ کر دائیں باتیں کانوں پر ہاتھ رکھتے اندر بھاگ گئیں۔

صبح مرزا نے پروفیسر کو ان کے اقوال و افعال شبینہ سے آگاہی بخشی تو



انہیں یقین نہیں آیا کہ ایسی نالائق کا صدور ان کی ذات سے ہو سکتا ہے۔ اُسی وقت جا کر اُس نیک بی بی سے مُعافی مانگنے پر بضد تھے۔ مرزا نے مشکل تمام باز رکھا۔ اُس رات انہیں مارے ندامت کے نیند نہیں آئی۔ نیند تو دوسری رات بھی نہیں آئی، مگر کسی اور وجہ سے۔ وہ وجہ یہ تھی کہ موصوفہ خود بنک میں تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ ایک گُرنے کی خرابی کی وجہ سے اس رات انٹرویو ٹھیک سے ریکارڈ نہیں ہوا۔ لہذا دوبارہ چلے۔ پر زحمت فرمائیں۔

اور ہاں! آج وہ (دونوں) کانوں میں موتیا کی کلیوں کی بالیاں پہنے ہوئے تھیں۔ کان کی ٹونہ جانے کتنی بار گلابی ہوئی ہوگی کہ جب وہ رخصت ہوئیں تو ایک ایک کلی کھل چکی تھی۔



## ہوتے مر کے ہم جو رسوا

اب تو معمولی سا بن گیا ہے کہ کہیں تعزیت یا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا پڑے تو مرزا کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر ہر شخص اظہارِ ہمدردی کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔ قطعہ تاریخ وفات ہی سہی۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں چپ لگ جاتی ہے جس سے بعض اوقات نہ صرف پس ماندگان کو بلکہ خود مجھے بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مرزا نے چپ نہ اسیکھا ہی تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحیح بات کو غلط موقع پر بے دغدغہ کہنے کی جو خدا داد صلاحیت انھیں ودیعت ہوئی ہے وہ کچھ ایسی ہی تقریبوں میں گل کھلاتی ہے۔ وہ گھپ اندھیرے میں سر ہلکے چراغ نہیں جلاتے، پھلجھڑی چھوڑتے ہیں جس سے بس ان کا اپنا چہرہ رات کے سیاہ فریم میں جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ اور پھلجھڑی کا لفظ تو یونہی مروت میں قلم سے نکل گیا، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے

اس کے باوصف وہ خدا کے اُن حاضر و ناظر بندوں میں سے ہیں جو محلے کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں شادی ہو یا غمی موجود ہوتے ہیں۔ بالخصوص دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب کے بعد اُٹھتے ہیں۔ اس اندازِ نشست و برخاست میں ایک کھلا فائدہ یہ دیکھا کہ وہ باری باری سب کی غیبت کر ڈالتے ہیں۔ ان کی کوئی نہیں کرپاتا۔



چنانچہ اس سینچر کی شام کو بھی میوہ شاہ قبرستان میں وہ میرے ساتھ تھے۔ سورج اس شہرِ خموشاں کو جسے ہزاروں بندگانِ خدا نے مرمر کے بسایا تھا، لال انگارہ سی آنکھ سے دیکھتا دیکھتا انگریزوں کے اقبال کی طرح غروب ہو رہا تھا۔ سامنے بیری کے درخت کے نیچے ایک ڈھانچہ قبر بدر پڑا تھا۔ چاروں طرف موت کی عمل داری تھی اور سارا قبرستان ایسا اُداس اور اُجاڑ تھا جیسے کسی بڑے شہر کا بازار اتوار کو۔ بھی رنجیدہ تھے۔ (بقول مرزا، دفن کے وقت میت کے علاوہ سب رنجیدہ ہوتے ہیں۔) مگر مرزا سب سے الگ تھلگ ایک پرانے کتبے پر نظریں گاڑے مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے پاس آئے اور میری پسلیوں میں اپنی کہنی سے آنکس لگاتے ہوئے اس کتبے تک لے گئے، جس پر منجملہ تاریخ، بدایتش و نیش، مولد و مسکن، ولدیت و عہدہ (اعزازی مجبٹریٹ درجہ سوم) اسودۃ لحد کی تمام ڈگریاں مع ڈوٹرین اور یونیورسٹی کے نام کے کندہ تھیں اور آخر میں نہایت جلی حروف میں، مُنہ پھیر کر جانے والے کو بذریعہ قطعہ بنارت دی گئی تھی کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے میں نے مرزا سے کہا ”یہ لوحِ مزار ہے یا ملازمت کی درخواست؟ بھلا ڈگریاں، عہدہ اور ولدیت وغیرہ لکھنے کا کیا تمک تھا؟“

انھوں نے حسبِ عادت بس ایک لفظ پکڑ لیا۔ کہنے لگے ”ٹھیک کہتے ہو جس طرح آج کل کسی کی عمر یا تنخواہ دریافت کرنا بری بات سمجھی جاتی ہے، اسی طرح بالکل اسی طرح بیس سال بعد کسی کی ولدیت پوچھنا بد اخلاقی سمجھی جائے گی؟“

اب مجھے مرزا کی جو پچال طبیعت سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ لہذا انھیں ولدیت کے مستقبل پر سکراتا چھوڑ کر میں آٹھ دس قبرِ دور ایک ٹکڑی میں شامل ہو گیا، جہاں ایک صاحبِ جنت مکانی کے حالاتِ زندگی مزے لے کر بیان کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ خدا



غریقِ رحمت کرے مرحوم نے اتنی لمبی عمر پائی کہ ان کے قریبی اعزہ دس پندرہ سال سے ان کی انشورنس پالیسی کی امید میں جی رہے تھے۔ ان امیدواروں میں سے بیشتر کو مرحوم خود اپنے ہاتھ سے مٹی دے چکے تھے۔ بقیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ مرحوم نے آپ حیات نہ صرف چمکا ہے بلکہ ڈگڈگا کے پی چکے ہیں۔ راوی نے تو یہاں تک بیان کیا کہ از بسکہ مرحوم شروع سے رکھ رکھاؤ کے حد درجہ قائل تھے، لہذا آخر تک اس صحت بخش عقیدے پر قائم رہے۔ چھوٹوں کو تعظیماً پہلے مرنا چاہیے۔ البتہ ادھر چند برسوں سے ان کو فلک کج رفتار سے یہ شکایت ہو چلی تھی کہ افسوس اب کوئی دشمن ایسا باقی نہیں رہا جسے وہ مرنے کی بددعا دے سکیں۔

ان سے کٹ کر میں ایک دوسری ٹولی میں جا ملا۔ یہاں مرحوم کے ایک شناسا اور میرے پڑوسی ان کے گیلٹر لڑکے کو صنبیریل کی تلقین اور گول مول الفاظ میں نعم البدل کی دُعائیتے ہوتے فرما رہے تھے کہ برخوردار! یہ مرحوم کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ حالانکہ پانچ منٹ پہلے یہی صاحب جی ہاں یہی صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مرحوم نے پانچ سال قبل دونوں بیویوں کو اپنے تیسرے سہرے کی بہاریں دکھائی تھیں اور یہ ان کے مرنے کے نہیں ڈوب مرنے کے دن تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے انگلیوں پر حساب لگا کر کانا پھوسی کے انداز میں یہ تک بتایا کہ تیسری بیوی کی عمر مرحوم کی پنشن کے برابر ہے۔ مگر ہے بالکل سیدھی اور بے زبان۔ اس اللہ کی بندی نے کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت نہیں ہیں۔ مگر مرحوم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے محض اپنی دعاؤں کے زور سے موصوفہ کا چال چلن قابو میں کر رکھا ہے۔ البتہ بیاتہا بیوی سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ بھری جوانی میں بھی میاں بیوی ۶۲ کے ہندسے کی طرح ایک دوسرے سے منہ پھیرے رہے اور جب تک جینے ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہے۔ ممدوحہ نے مشہور کر رکھا تھا کہ



(خدا ان کی رُوح کو نہ شرمانے) مرحوم شروع سے ہی ایسے ظالم تھے کہ ولیمے کا کھانا بھی مجھ نہی نویلی دہن سے پکوا یا۔

میں نے گفتگو کا رُخ موڑنے کی خاطر گنجان قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چپہ چپہ آباد ہو گیا۔ مرزا حسب معمول پھر بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگے، دیکھ لینا وہ دن زیادہ دُور نہیں جب کراچی میں مُردے کو کھڑا گاڑنا پڑے گا اور نائیون کے ریڈی میڈ کفن میں اوپر زپ (ZIP) لگے گی تاکہ منہ دیکھنے دکھانے میں آسانی رہے۔

میری طبیعت ان باتوں سے ادب نے لگی تو ایک دُوسرے غول میں چلا گیا، جہاں دو نوجوان تار کے خلاف جیسی تیلوں میں چڑھتے چمک رہے تھے۔ پہلے ”ٹیڈی بوائے“ کی پیلی قمیض پر لڑکیوں کی ایسی واہیات تصویریں بنی ہوئی تھیں کہ نظر پڑتے ہی ثقہ آدمی لاجول پڑھنے لگتے تھے اور ہم نے دیکھا کہ ہر ثقہ آدمی بار بار لاجول پڑھ رہا ہے۔ دُوسرے نوجوان کو مرحوم کی بے وقت موت سے واقعی دلی صدمہ پہنچا تھا، کیونکہ اس کا سارا ”ویک اینڈ“ چوڑا ہو گیا تھا۔ چونچوں اور چہلوں کا یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا کہ اتنے میں ایک صاحب نے ہمت کر کے مرحوم کے حق میں پہلا کلمہ خیر کہا اور میری جان میں جان آئی۔ انھوں نے صبح فرمایا ”یوں آکھ بند ہونے کے بعد لوگ کیڑے نکالنے لگیں، یہ اور بات ہے، مگر خدا ان کی قبر کو عنبریں کرے، مرحوم بلاشبہ صاف دل، نیک نیت انسان تھے اور نیک نام بھی۔ یہ بڑی بات ہے۔“

”نیک نامی میں کیا کلام ہے۔ مرحوم اگر یونہی منہ ہاتھ دھونے بیٹھ جاتے تو سب یہی سمجھتے کہ وضو کر رہے.....“ جملہ ختم ہونے سے پہلے مداح کی چمکتی چند یا یکا ایک ایک دھنسی ہوئی قبر میں غروب ہو گئی۔



اس مقام پر ایک تیسرے صاحب نے (جن سے میں واقف نہیں) ”رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ“ والے لہجے میں نیک نیتی اور صاف دلی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ اپنی پیدائشی بُز دلی کے سبب تمام عمر گناہوں سے بچے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعضوں کے دل و دماغ واقعی آئینے کی طرح صاف ہوتے ہیں — یعنی نیک خیال آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

شامتِ اعمال کہ میرے منہ سے نکل گیا ”نیت کا حال صرف خدا پر روشن ہے مگر اپنی جگہ یہی کیا کم ہے کہ مرحوم سب کے دکھ سکھ میں شریک اور ادنیٰ سے ادنیٰ پڑوسی سے بھی جھک کر ملتے تھے۔“

ارے صاحب! یہ سنتے ہی وہ صاحب تو لال بھبر کا ہو گئے۔ بولے ”حضرت! مجھے خدائی کا دعویٰ تو نہیں۔ تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اکثر بوڑھے خزانٹ اپنے پڑوسیوں سے محض اس خیال سے جھک کر ملتے ہیں کہ اگر وہ خفا ہو گئے تو کندھا کون دے گا۔“

خوش قسمتی سے ایک خدا ترس نے میری حمایت کی۔ میرا مطلب ہے مرحوم کی حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم نے ”ماشاء اللہ“ اتنی لمبی عمر پائی۔ مگر صورت پر ذرا نہیں برستی تھی۔ چنانچہ سوائے کنپٹیوں کے اور بال سفید نہیں ہوتے۔ چاہتے تو خضاب لگا کے خورد و دل میں شامل ہو سکتے تھے مگر طبیعت ایسی قلندرانہ پائی تھی کہ خضاب کا کبھی جھوٹوں بھی خیال نہیں آیا۔

وہ صاحب سچ مچ پھٹ پڑے ”آپ کو خبر بھی ہے؟ مرحوم کا سارا سر پہلے نکاح کے بعد ہی سفید کالا ہو گیا تھا۔ مگر کنپٹیوں کو وہ قصداً سفید رہنے دیتے تھے تاکہ کسی کو شبہ نہ گزرے کہ خضاب لگاتے ہیں۔ سلور گرے قلمیں! یہ تو ان کے میک اپ میں ایک انجیل سچ تھا!“



”ارے صاحب! اسی مصلحت سے انھوں نے اپنا ایک مصنوعی دانت بھی توڑ رکھا تھا“ ایک دوسرے بدگوئی نے نابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔

”کچھ بھی سہی وہ ان کھوسٹوں سے ہزار درجے بہتر تھے جو اپنے پوپے منہ اور سفید بالوں کی داد چھوٹوں سے یوں طلب کرتے ہیں، گویا یہ ان کی ذاتی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔“ مرزا نے بگڑی بات بنائی۔

اُن سے پیچھا چھڑا کر کچی پکی قبریں پھانڈتا میں منشی ثناء اللہ کے پاس جا پہنچا جو ایک کتبے سے ٹیک لگاتے بیری کے ہرے ہرے پتے کچر کچر چارہ سے تھے اور اس امر پر بار بار اپنی حیرانی کا اظہار فرما رہے تھے کہ ابھی پرسوں تک تو مرحوم باتیں کر رہے تھے۔ گویا ان کے اپنے آدابِ جانکشی کی رُو سے مرحوم کو مرنے سے تین چار سال پہلے چپ ہو جانا چاہیے تھا۔ بھلا مرزا ایسا موقع کہاں خالی جلنے دیتے تھے۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے، یاد رکھو! مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔

یوں تو مرزا کے بیان کے مطابق مرحوم کی بیویاں بھی ایک دوسرے کی چھاتی پر دوہتر مار مار کر بین کر رہی تھیں، لیکن مرحوم کے بڑے نواسے نے جو پانچ سال سے بے روزگار تھا، چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھالیا تھا۔ منشی جی بیری کے پتوں کا رس چوس چوس کر جتنا اسے سمجھاتے پھپھارتے، اتنا ہی وہ مرحوم کی نپشن کو یاد کر کے دھاڑیں مار مار کر دوتا۔ اسے اگر ایک طرف حضرت عزرائیل سے گلہ تھا کہ انھوں نے تیس تاریخ تک انتظار کیوں نہ کیا تو دوسری طرف خود مرحوم سے بھی سخت شکوہ تھا

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مڑتا کوئی دن اور؟

ادھر منشی جی کا سارا زور اس فلسفے پر تھا کہ بنخوردار! یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔



درحقیقت زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ کم از کم ایشیا میں۔ نیز مرحوم بڑے نصیبہ ور نکلے کہ دنیا کے بکھیروں سے اتنی جلدی آزاد ہو گئے۔ مگر تم ہو کہ ناحق اپنی جوان جان کو ہلاک کیے جا رہے ہو۔ یونانی مثل ہے کہ

وہی مرتا ہے جو محبوب خدا ہوتا ہے

حاضرین ابھی دل ہی دل میں حسد سے جلے جا رہے تھے کہ ہاتے، مرحوم کی آئی ہمیں کیوں نہ آگئی کہ دم بھر کو بادل کے ایک فالستی ٹکڑے نے سورج کو ڈھک لیا اور ہلکی ہلکی بھوار پڑنے لگی۔ غشی جی نے یکبارگی بیری کے پتوں کا پھوک نکلتے ہوئے اس مرحوم کے ہبشتی ہونے کا غیبی شگون قرار دیا۔ لیکن مرزا نے بھرے مجمع میں سر ملا ہلا کر اس پیشگوئی سے اختلاف کیا۔ میں نے الگ لے جا کر وجہ پوچھی تو ارشاد ہوا:

”مرنے کے لیے سنیچر کا دن بہت منحوس ہوتا ہے۔“

لیکن سب سے زیادہ پتلا حان مرحوم کے ایک دوست کا تھا، جن کے انسوکسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے کہ انھیں مرحوم سے دیرینہ ربط و رفاقت کا دعویٰ تھا۔ اس روحانی یک جہتی کے ثبوت میں اکثر اس واقعے کا ذکر کرتے کہ بغدادی قاعدہ ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہم دونوں نے ایک ساتھ سگرٹ پیا سیکھا۔ چنانچہ اس وقت بھی صاحب موصوف کے بین سے صاف ٹپکتا تھا کہ مرحوم کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت داغ بلکہ دغا دے گئے اور بغیر کہے سنے پیچھا چھڑا کے چپ چپاتے جنت الفردوس کو روانہ ہو گئے۔

اکیلے ہی اکیلے!

بعد میں مرزا نے صراحت بتایا کہ باہمی اخلاص و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ مرحوم نے اپنی موت سے تین ماہ پیشتر موصوف سے دس ہزار روپے سکہ رائج الوقت بطور قرض حسنہ



لیے اور وہ تو کہیے، بڑی خیریت ہوئی کہ اسی رقم سے تیسری بیوی کا مہر معجل بیاق کر گئے  
ورنہ قیامت میں اپنے ساس سسر کو کیا منہ دکھاتے۔

(۲)

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ گنجان محلّوں میں مختلف بلکہ متضاد تقریبیں ایک دوسرے  
میں بڑی خوبی سے ضم ہو جاتی ہیں۔ گویا دونوں وقت مل رہے ہوں۔ چنانچہ اکثر حضرات  
دعوتِ ولیمہ میں ہاتھ دھوئے وقتِ چہلم کی بریانی کی ڈکار لیتے، یا سویم میں شبینہ فتوحات  
کی لذیذ داستان سناتے پکڑے جاتے ہیں۔ لذتِ ہمسائیگی کا یہ نقشہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا  
کہ ایک کوارٹر میں سہی مومن منایا جا رہا ہے تو رت جگا دیوار کے اس طرف ہو رہا ہے۔ اور  
یوں بھی ہوتا ہے کہ دائیں طرف والے گھر میں آدمی رات کو قوال بلیاں لٹا رہے ہیں، تو  
حالِ بائیں طرف والے گھر میں آرہا ہے۔ آمدنی ہمسائے کی بڑھتی ہے تو اس خوشی میں ہمارے  
خرچ ہمارے گھر کا بڑھتا ہے اور یہ سانچہ بھی بارہا گزرا کہ مچھلی طرح دار پڑوسن نے پکاتی اور  
مذقوں اپنے بدن سے تری خوشبو آتی

اس تقریبی گھیلے کا صحیح اندازہ مجھے دوسرے دن ہوا جب ایک شادی کی تقریب  
میں تمام وقت مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات کے تذکرے ہوتے رہے۔ ایک بزرگ نے کہ  
صورت سے خود پایہ رکاب معلوم ہوتے تھے، تشویش ناک لہجے میں پوچھا، آخر ہوا کیا؟ جو اب  
میں مرحوم کے ایک ہم جماعت نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ مرحوم جوانی میں اشتہاری  
امراض کا شکار ہو گئے۔ ادھیر عمر میں جنسی تونس میں مبتلا رہے۔ لیکن آخری ایام میں تقویٰ  
ہو گاتا تھا۔



”پھر بھی آخر ہوا کیا؟“ پایہ رکاب مرد بزرگ نے اپنا سوال ذمہ لیا۔  
 ”بھلے چنگے تھے۔ اچانک ایک ہچک آئی اور جہاں جتن ہو گئے“ دوسرے بزرگ نے  
 انگوچھے سے ایک فرضی آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”سنا ہے چالیس برس سے مرض الموت میں مبتلا تھے“ ایک صاحب نے سونکھے  
 سے منہ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”چالیس برس سے کھانسی میں مبتلا تھے اور آخر اسی میں انتقال فرمایا۔“  
 ”صاحب! جنتی تھے کہ کسی اجنبی مرض میں نہیں مرے۔ ورنہ اب تو میڈیکل  
 سائنس کی ترقی کا یہ حال ہے کہ روز ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔“  
 ”آپ نے گاندھی گارڈن میں اس بوہری سیٹھ کو کار میں چپل قدمی کرنے نہیں  
 دیکھا جو کہتا ہے کہ میں ساری عمر دے پر اتنی لاگت لگا چکا ہوں کہ اب اگر کسی اور مرض میں  
 مرنا پڑا تو خدا کی قسم، خودکشی کر لوں گا۔“ مرزا چٹکوں پر اتر آتے۔  
 ”واللہ! موت ہو تو ایسی ہو! (سہسکی) مرحوم کے ہونٹوں پر عالم سکرات  
 میں بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔“

”اپنے قرعہ خواہوں کا خیال آ رہا ہوگا“ مرزا میرے کان میں ہنسی بھرتے۔  
 ”گنہ گاروں کا منہ مرتے وقت سوجھیا ہو جاتا ہے، مگر چشم بد دور۔“  
 چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔

”صاحب! سیٹی رنگ کا گلاب ہم نے آج تک نہیں دیکھا“ مرزا کی ٹھنڈی  
 ٹھنڈی ناک میرے کان کو چھونے لگی اور ان کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلنے لگیں۔



کوئی بچہ چلیے فریج پر گیلی انگلی رکھ رہا ہو۔

اصل الفاظ تو ذہن سے محو ہو گئے، لیکن اتنا اب بھی یاد ہے کہ انکو چھ دے بزرگ نے ایک فلسفیانہ تقریر کر ڈالی، جس کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا کہ جینے کا کیا ہے۔ جینے کو تو جانو بھی جی لیتے ہیں، لیکن جس نے مرنا نہیں سیکھا، وہ جینا کیا جانے۔ ایک مثبت سم خود سپردگی، ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کے لیے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے بڑے بزرگ عرصے کا کام ہے، بندہ نواز!

پھر انھوں نے بے موت مرنے کے خاندانی نسخے اور ہتے کھیلے اپنی روح قبض کرنے کے پیشترے کچھ ایسے استادانہ تیور سے بیان کیے کہ ہمیں عطائی مرنے والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی۔

ناتوا کلام اس پر ہوا کہ مرحوم نے کسی روحانی ذریعے سے سُن گن پام تھی کہ میں سنیچر کوہ ہمارا گا۔

”میر نے والے کے متعلق یہی کہا جاتا ہے“ باتسور نیض والا ٹیڈی بولتے بولا۔

”کہ سنیچر کو مر جانے گا؟“ مرزا نے اس بد لگام کامنہ بند کیا۔

انکو پنے والے بزرگ نے شے مذکور سے پہلے اپنے نری کے جوتے کی گرد جھاڑ

پھر میٹائی۔ سرسبز پونچھے ہوئے مرحوم کے عرفان مرگ کی شہادت دی کہ جنت مکانی نے

وصاں سے تھیک چاہیں دن پہلے مجھ سے فرمایا تھا کہ انسان فانی ہے!

انسان کے تعلق یہ تازہ خبر سُن کر مرزا مجھے تھلیے میں لے گئے۔ درہل تھلیے کا

لفظ انھوں نے استعمال کیا تھا، ورنہ جس جگہ وہ مجھے دھکیلے ہوئے لے گئے تھے زلزلے

کا زمانہ اس سرحد پر ایک حوتہ تھا، جہاں ایک میراث گھونٹ نکالے ڈھونڈ پر گھڑیا



گارہی تھی۔ وہاں انھوں نے اس شغف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو مرحوم کو اپنی موت سے تھا، مجھے آگاہ کیا کہ یہ ڈراما تو جنت مکانی اکثر کھیلا کرتے تھے۔ اوصی آخری راتوں کو اپنی ہونے والی بیواؤں کو جگا کر دھمکیاں دیتے کہ میں اچانک اپنا سایہ تمھارے سر سے اٹھا لوں گا۔ چشم زدن میں مانگ اُجاڑ دوں گا۔ اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی کہا کرتے کہ وا خدا! اگر خود کشی جرم نہ ہوتی تو کبھی کا اپنے گلے میں بھندا ڈال لیتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنی آپ کو مردہ تصور کر کے ڈکرانے لگتے اور چشم تصور سے نبھلی کے سونٹا سے ہاتھ دیکھ کر کہتے : بخدا! میں تمھارا رنڈا پا نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے والے کی ایک ایک خوبی بیان کر کے خشک سکیاں بھرتے اور سسکیوں کے درمیان سگریٹ کے کش لگاتے اور جب اس عمل سے بچے اوپر رقت طاری کر لیتے تو رومال سے بار بار آنکھ کے بجائے اپنی ڈبڑا لی ہوئی ناک پر نہچتے جلاتے۔ پھر جب شدتِ گریہ سے ناک سُرخ ہو جاتی تو ذرا صبر آتا اور وہ عالمِ تصور میں رہنے لگیں پاتے ہوئے ہاتھ سے تینوں بیواؤں کی مانگ میں یکے بعد دیگرے دوسروں افسانے بتاتے اس سے فارغ ہو کر ہر ایک کو کہنیوں تک مہین مہین پھنسی پھنسی چوڑیاں پہناتے (بیابا ہوتا کو چار چوڑیاں کم پہناتے تھے)۔

حالانکہ اس سے پہلے بھی مرزا کو کئی مرتبہ ٹوک چکا تھا کہ خاقانی ہندوستان و ذوق ہر قصیدے کے بعد منہ بھر بھر کے کلیاں کیا کرتے تھے۔ تم پر ہر کلمے ہر فقرے کے بارے واجب ہیں۔ لیکن اس وقت مرحوم کے بارے میں یہ اول جلول باتیں اور ایسے عجیبے میں سن کر میری طبیعت کچھ زیادہ ہی منعقد ہو گئی۔ میں نے دوسروں پر ڈھال کر دیا کہ سنائی۔

یہ کیسے سلمان ہیں مرزا! دُعائے مغفرت نہیں کرتے نہ کہیں۔ مگر ایسی باتیں



کیوں بنتے ہیں یہ لوگ؟

”خلق خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ لوگوں کا منہ تو چپلم کے نوالے ہی سے بند ہوتا ہے۔“

(۲)

مجھے چپلم میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔ لیکن سوائے ایک نیک طینت مولوی رضا کے جو پلاٹ کے چاولوں کی لمبائی اور گلاؤں کو مرحوم کے ٹھیٹ جتنی ہونے کی نشانی قرار دے رہے تھے، بقیہ حضرات کی گل افشانی گفتار کا وہی انداز تھا۔ وہی جگ جگے تھے، وہی چھپنے ایک بزرگوار جوان قورمے کے ہر آتشیں لقمے کے بعد آدھا آدھا گلاس پانی پی کر قیامت سیر بلکہ سیراب ہو گئے تھے، منہ لال کر کے بولے کہ مرحوم کی اولاد نہایت نام نہان ہے۔ مرحوم دُغفور شد و دے وصیت فرما گئے تھے کہ میری مٹی بغداد لے جانی جائے۔ لیکن نافرمان اولاد نے ان کی آخری خواہش کا ذرا پاس نہ کیا۔

ان کا ایک منہ بھٹ پڑوسی بول اٹھے ”صاحب! یہ مرحوم کی سراسر زیادتی تھی کہ انھوں نے خود کو تادم مرگ میڈیچل حدود سے قدم باہر نہیں نکالا۔ حد یہ کہ پاسپورٹ تک نہیں نوا.....“

ایک ایس صاحب نے قانونی موٹگانی کی ”بین الاقوامی قانون کے بموجب پاسپورٹ کی شرائط و ضوابط کے لیے ہے۔ مردے پاسپورٹ کے بغیر بھی جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔“

”لے جاتے جاسکتے ہیں“ مرزا پھر نغمہ بے گئے۔



”میں کہہ رہا تھا کہ یوں تو ہر مرنے والے کے سینے میں یہ خواہش سلگتی رہتی ہے کہ میرا کانسے کا مجسمہ (جسے قد آدم بنانے کے لیے بسا اوقات اپنی طرف سے پورے ایک فٹ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے) میونسپل پارک کے بچوں بیچ استادہ کیا جائے اور۔۔۔“ اور جملہ نازنینان شہر چار مہینے دس دن تک میرے لاشے کو گود میں لیے بال بکھرائے بیٹھی رہیں ”مرزائے دوسرا مصرع لگایا۔

”مگر صاحب! وصیتوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارے چھپن کا قصہ ہے پیل والی حویلی کے پاس ایک جھونپڑی میں ۳۹ سالہ ایک انہی رہتا تھا۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق عمر ۶۶ سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی، اس لیے کہ خود کہتا تھا کہ سپیٹھ سال سے تو افیم کھا رہا ہوں۔ چوبیس گھنٹے انٹا غفیل رہتا تھا۔ ذرا نشہ ٹوٹا تو منہ موم ہو جاتا۔ غم یہ تھا کہ دنیا سے بے اولاد اجارہ ہوں۔ اللہ نے کوئی اولاد نہ دی جو اس کی بان کی چارپائی کی جائز وارث بن سکے! اس کے متعلق محلے میں مشہور تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نہیں نہایا ہے۔ اس کو اتنا تو ہم نے بھی کہتے سنا کہ خدا نے پانی صرف پینے کے لیے بنایا تھا مگر انسان بڑا ظالم ہے

راحتیں اور بھی ہیں غسل کی راحت کے سوا

ہاں تو صاحب! جب اس کا دم آخر ہونے لگا تو محلے کی مسجد کے امام کا ہاتھ اپنے ڈوبتے دل پر رکھ کر یہ قول و قرار کیا کہ میری میت کو غسل نہ دیا جائے۔ بس پورے پورے ہاتھوں سے تسمیم کر کے کفنا دیا جائے ورنہ حشر میں دامن گیر ہوں گا۔“

وکیل صاحب نے تائید کرتے ہوئے فرمایا ”اکثر مرنے والے اپنے کرنے کے کام پسند گان کو سوئپ کر ٹھنڈے ٹھنڈے سدھار جاتے ہیں۔ پھلی گرمیوں میں دیوانی



عدالتیں بند ہونے سے چند یوم قبل ایک مقامی شاعر کا انتقال ہوا۔ واقعہ ہے کہ اُن کے جیتے جی کسی فلمی رسالے نے بھی ان کی عُریاں نظموں کو شرمندہ طباعت نہ کیا۔ لیکن آپ کو حیرت ہو گی کہ مرحوم اپنے بھتیجے کو ایصالِ ثواب کی یہ راہ سمجھا گئے کہ بعدِ مُردن میرا کلام حنائی کاغذ پر چھپوا کر سال کے سال میری برسی پر فقیروں اور مُدیروں کو بلا ہدیہ تقسیم کیا جائے۔ پڑوسی کی ہمت اور بڑھی ”اب مرحوم ہی کو دیکھیے۔ زندگی میں ہی ایک قطعہ اراضی اپنی قبر کے لیے بڑے ارمانوں سے رجسٹری کر لیا تھا گو کہ بچارے اس کا قبضہ پورے بارہ سال بعد لے پاتے۔ نصیحتوں اور وصیتوں کا یہ عالم تھا کہ موت سے دس سال پیشتر اپنے نواسوں کے ایک فہرست حوالے کر دی تھی، جس میں نام بنام لکھا تھا کہ فلاں ولد فلاں کو میرا مٹہ نہ دکھایا جائے۔ (جن حضرات سے زیادہ آزدہ خاطر تھے، ان کے نام کے آگے ولدیت نہیں لکھی تھی) تیسری شادی کے بعد انھیں اس کا طویل ضمیمہ مرتب کرنا پڑا، جس میں تمام جوان پڑوسیوں کے نام شامل تھے۔“

”ہم نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ مرحوم نہ صرف اپنے جنازے میں شرکا کی تعداد متعین کر گئے بلکہ آج کے چہلم کا ’مینو‘ بھی خود ہی طے فرما گئے تھے۔“ وکیل نے خاکے میں شوخ رنگ بھرا۔

اس نازک مرحلے پر خشنی ڈال ہی والے بزرگ نے پلاؤ سے سیر ہو کر اپنے شکم پر ہاتھ پھیرا اور ’مینو‘ کی تائید و توصیف میں ایک مسلسل ڈکار و اغی، جس کے اختتام پر اس معصوم حسرت کا اظہار فرمایا کہ کاش آج مرحوم زندہ ہوتے تو یہ انتظامات دیکھ کر کتنے خوش ہوتے!

اب پڑوسی نے تیغِ زبان کو بے نیام کیا ”مرحوم سدا سے سُورہِ ہضم کے مریض تھے۔“



غذا تو غذا، بچارے کے پیٹ میں بات تک نہیں ٹھیرتی تھی۔ چٹ پٹی چیزوں کو ترستے ہی مرنے۔ میرے گھر میں سے بتا رہی تھیں کہ ایک دفعہ ملیریا میں سرسام ہو گیا اور لگے بہکنے۔ بار بار اپنا منہ بھلا کے زانو پر ٹخنے اور سہاگ کی قسم دلا کر یہ وصیت کرتے تھے کہ ہر جمعرات کو میری فاسخہ، چاٹ اور کنواری بکری کی سری پر دلوائی جائے۔“

مرزا پھر ٹک ہی تو گئے۔ ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے بولے ”صاحب! وصیتوں کی کوئی حد نہیں۔ ہمارے محلے میں ڈیڑھ پونے دو سال پہلے ایک اسکول ماسٹر کا انتقال ہوا، جنہیں میں نے عید بقرعید پر بھی سالم و ثابت پا جامہ پہنے نہیں دیکھا۔ مگر مرنے سے پہلے وہ بھی اپنے لڑکے کو ہدایت کر گئے کہ

پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا!

لیکن حضور ابا کی آخری وصیت کے مطابق فیض کے اسباب بنانے میں لڑکے کی مفلسی کے علاوہ ملک کا قانون بھی مزاحم ہوا۔“

”یعنی کیا؟“ وکیل صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔

”یعنی یہ کہ آج کل پل بنانے کی اجازت صرف پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کو ہے۔ اور بالفرض محال کراچی میں چار فٹ گہرائیوں کھود بھی لیا تو پولیس اس کا کھاری کیپٹر پیٹنے والوں کا چالان اقدام خودکشی میں کر دے گی۔ یوں بھی پٹیچر سے پٹیچر قصبے میں آج کل کنوئیں صرف ایسے ویسے موقعوں پر ڈوب مرنے کے لیے کام آتے ہیں۔ رہے تالاب، تو حضور! لے دے کے ان کا یہ مصرف رہ گیا ہے کہ دن بھر ان میں گاؤں کی بھینسیں نہایتیں اور صبح جیسی آتی تھیں، اس سے کہیں زیادہ گندی ہو کر چراغ جلے باڑے میں پہنچیں۔“



خدا خدا کر کے یہ مکالمہ ختم ہوا تو پٹاخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا:

”مرحوم نے کچھ چھوڑا بھی؟“

”بچے چھوڑے ہیں!“

”مگر دوسرا مکان بھی تو ہے۔“

”اُس کے کرایے کو اپنے مزار کی سالانہ مرمت سفیدی کے لیے وقف

کر گئے ہیں۔“

”پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ بیاہتا بیوی کے لیے ایک انگوٹھی بھی چھوڑی ہے۔“

اگر اس کا نگینہ اصلی ہوتا تو کسی طرح بیس ہزار سے کم کی نہیں تھی۔“

”تو کیا نگینہ جھوٹا ہے؟“

”جی نہیں۔ اصلی امی شیشن ہے!“

”اور وہ پچاس ہزار کی انشورنس پالیسی کیا ہوئی؟“

”وہ پہلے ہی منجھلی کے مہر میں لکھ چکے تھے۔“

”اس کے بارے میں یار لوگوں نے لطیفہ گھڑ رکھا ہے کہ منجھلی بیوہ کہتی ہے

کہ سرتاج کے بغیر زندگی اجیرن ہے۔ اگر کوئی ان کو دوبارہ زندہ کر دے تو میں بخوشی

دس ہزار لوٹنے پر تیار ہوں۔“

”ہم سناہ خانگی ذرائع سے سنا ہے کہ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت

نصیب کرے“ مرحوم منجھلی پر ایسے لوط سے تھے کہ اب بھی راتِ برات خوابوں میں

آکر ڈراتے ہیں۔“

”مرحوم اگر ایسا کرتے ہیں تو بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ ابھی تو ان کا کفن بھی



میل نہیں ہوا ہوگا۔ گرسنے میں کہتے کہ بھلی نیچے گپٹے دیپے اور مٹا شروع کر رہا ہے۔  
 ”اگر بھلی ایسا کرتی ہے تو بالکل ٹھیک کرتی ہے۔ آپ نے مٹا ہوگا کہ ایک ٹالے  
 میں لکھنؤ کے نیچے جٹے ہیں یہ رواج تھا کہ چالیسویں برس صرف انوارہ واقسام کے پرتکلف  
 کھانوں کا اہتمام کیا جاتا بلکہ یہ بھی سوار شکار کر کے بھٹی تھی تاکہ مرغوم کی تری ہوئی نہ رہے  
 کا حقہ امتنع ہو سکے۔ مرزا نے ’ج‘ اور ’خ‘ صحیح خرچ سے ادا کر کے آٹھ سو روپے پر آخری  
 دہانہ لگایا۔

دراپہ پر پڑتے ہیں میں نے مرزا کو آٹھ ہاتھوں لیا مجھے کو تم نے وعظ نہیں سنا؟  
 مولوی صاحب نے کہا تھا کہ مرے ہون کا ذکر تو اچھائی کے ساتھ۔ موت کو نہ بھولو کہ  
 ایک نہ ایک دن سب کو آنی ہے۔  
 شرک پار کرتے کرنے ایک دم بیچ میں اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا ”اگر کوئی مولوی  
 یہ ذمہ لے لے کہ مرزا کے بعد میرے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ لکھا جائے گا تو آج ہی —  
 اسی وقت اسی جگہ مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہاری جان کی تس سم!“  
 آخری فقرہ مرزا نے ایک بے صبری کار کے بیپر پر تقریباً اکڑوں بیٹھ کر جاتے ہوئے  
 ادا کیا۔

(جولائی ۱۹۶۱ء)



## ہل اسٹیشن

ان دنوں مزا کے اعصاب پر ہل اسٹیشن بُری طرح سوار تھا۔ لیکن ہمارا حال ان سے بھی زیادہ خستہ تھا۔ اس لیے کہ ہم پر مزا اپنے متاثرہ اعصاب اور ہل اسٹیشن سمیت سوار تھے جان ضیق میں تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اسی کا ذکر، اسی کا ورد۔ ہوا یہ کہ وہ سرکاری فوج پر دو دن کے لیے کوئٹہ ہو آئے تھے اور اب اس پر مچلتے تھے کہ ہم بلا تنخواہ رخصت پر ان کے ساتھ دو مہینے وہاں گزار آئیں، جیسا کہ گرمیوں میں شرفا و عمائدین کراچی کا دستور ہے۔ ہم نے کہا، سچ پوچھو تو ہم اسی لیے وہاں نہیں جانا چاہتے کہ جن لوگوں کے سلسلے سے ہم کراچی میں سال بھر بچتے پھرتے ہیں، وہ سب مٹی جون میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ بولے، ٹھیک کہتے ہو۔ مگر بندہ خدا! اپنی صحت تو دیکھو۔ تمہیں اپنے بال بچوں پر ترس نہیں آتا؟ کب تک حکیم ڈاکٹروں کا پیٹ پالتے رہو گے؟ وہاں پہنچتے ہی بغیر دوا کے چاق چو بند ہو جاؤ گے۔ پانی میں دوا کی تاثیر ہے اور (مُسکراتے ہوئے) کسی کسی دن مزا بھی ویسا ہی۔ یوں بھی جو وقت پہاڑ پر گزرے، عمر سے منہا نہیں کیا جاتا۔ مکھی مچھر کا نام نہیں کیچر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس لیے کہ پانی کی سخت قلت ہے۔ لوگوں کی ندرستی کا حال تمہیں کیا بتاؤں۔ جسے دیکھو، گالوں سے گلابی رنگ ٹپکا پڑ رہا ہے۔ ابھی پچھلے سال وہاں ایک وزیر نے اسپتال کا افتتاح کیا تو تین دن پہلے ایک مریض کو کراچی سے بلوانا پڑا اور اس کی نگرانی پر چار بڑے ڈاکٹر تعینات کیے گئے کہ



کہیں وہ رسم افتتاح سے پہلے ہی صحت یاب نہ ہو جاتے۔ ہم نے کہا، آہ وہ اپنی جگہ، مگر ہم دوا کے بغیر اپنے تئیں مارل محسوس نہیں کرتے۔ بولے، اس کی فکر نہ کرو۔ کوئٹہ میں آنکھ بند کر کے کسی بھی بازار میں کل جاؤ۔ ہر تیسری دکان دواؤں کی ملے گی اور ہر دوسری دکان تنوری روٹیوں کی۔ پوچھا، اور پہلی دکان؟ بولے اس میں ان دکانوں کے لیے سائن بورڈ تیار کیے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا لیکن کراچی کی طرح وہاں قدم قدم پر ڈاکٹر کہاں؟ آج کل تو بغیر ڈاکٹر کی مدد کے آدمی مر بھی نہیں سکتا۔ کہنے لگے، چھوڑو بھی! فرضی بیماریوں کے لیے تو یونانی دوا تیر ہدفنا ہوتی ہیں۔

ہمارے بے جاشکوک اور غلط فہمیوں کا اس مدلل طریقے سے ازالہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنا وکیلوں کا سالب ولجہ چھوڑا اور بڑی گرم جوشی سے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ”ہم نیک و بد حضور کو سمجھاتے جاتے ہیں“ والے انداز میں کہا ”بھئی! اب تمہارا شمار بھی حیثیت داروں میں ہونے لگا۔ جیسی تو بینک کو پانچ ہزار قرض دینے میں ذرا پس و پیش نہ ہوا۔ واللہ! میں حسد نہیں کرتا۔ خدا جلد تمہاری حیثیت میں اتنی ترقی دے کہ پچاس ہزار تک مقروض ہو سکو۔ میں اپنی جگہ صبر یہ کہنا چاہتا تھا کہ اب تمہیں اپنے انکم برکیٹ والوں کی طرح گرمیا گزاریں۔ ایشین جانا چاہیے۔ یہ نہیں تو کم از کم چھٹی لے کر گھر ہی بیٹھ جایا کرو۔ تمہارا یوں کھلے عام سڑکوں پر پھرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میری سنو ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ گرمیوں میں کچھ یہی دن تھے۔ میری بڑی بچی اسکول سے کوئی تو بہت روہانسی تھی۔ کریدنے پر پتہ چلا اس کی ایک سہیلی نے جو وادی سوات جا رہی تھی، طعنہ دیا کہ کیا تم لوگ نادار ہو، جو سال بھر اپنے ہی گھر میں رہتے ہو۔ صاحب! وہ دن ہے اور آج کا دن، میں تو ہر سال سٹی جون میں چھٹی لے کر انکم برکیٹ۔ مساوی آمدنی والوں کا طبقہ۔



کے کرمح اہل و عیال ”انڈر گراؤنڈ“ ہو جاتا ہوں۔ پھر انھوں نے کراچی کے اور بھی بہت سے زمیں دوز شرفار کے نام بتاتے جو انہی کی طرح سال کے سال اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنا یہ وار کا گر ہوتا دیکھا تو ”ناک آؤٹ“ ضرب لگائی۔ فرمایا ”تم جہاد ہر سال سے زحمت پر نہیں گئے تو لوگوں کو خیال ہو چلا ہے کہ تم اس ڈر کے مارے نہیں کھکتے کہ دفتر والوں کو کہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ تمہارے بغیر بھی بخوبی کام چل سکتا ہے۔“

قصہ حاتم طائی میں ایک طلسماتی پہاڑ کا ذکر آتا ہے۔ کوہِ ندا اس کا نام ہے اور یہ نام یوں پڑا کہ قلعہ کوہ سے ایک عجیب و غریب آواز آتی ہے کہ جس کسی کو یہ سنائی دے وہ جس حالت میں جہاں بھی ہو بے اختیار اسی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت کوئی رشتہ نانا، کوئی بندھن اسے روک نہیں سکتا۔ اب لوگ اسے قصہ کہانی سمجھ کر مسکرا دیتے ہیں حالانکہ سننے والوں نے سنا ہے کہ ایسی آواز اب ہر سال ہر پہاڑ سے آنے لگی ہے۔ مرزا کا کہنا ہے کہ یہ آواز جب تمہیں پہلے پہل سنائی دے تو اپنی مفلسی کو اپنے اور پہاڑ کے درمیان حائل نہ ہونے دو۔ لہذا طے پایا کہ صحت اور غیرت کا یہی تقاضا ہے کہ ہل آئیشن چلا جائے۔ خواہ مزید قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ہم نے دبے لہجے میں یاد دلایا کہ قرض مقرض محبت ہے۔ مرزا بولے، دیکھتے نہیں، لوگ اس مقرض کو کیسی پاکدستی سے استعمال کر کے اپنی مشکلات و دوسروں کو منتقل کر دیتے ہیں؟ صاحب! ہنرمند کے ہاتھ کیا اوزار بھی ہتھیار بن جاتا ہے۔ یہاں یہ دنیاوت غالباً بے محل نہ ہوگی کہ قرض کے باب میں مرزا کا پندرہ بیس سال سے وہی عقیدہ ہے جو مولینا حالی کا علم و مہر کے بارے میں تھا یعنی ہر طرح سے حاصل کرنا چاہیے

جس سے ملے جہاں سے ملے جس سے ملے



لیکن ہم نے اتنی شرط ضرور لگا دی کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ساتھ ہوں گے تو ذرا دل لگی رہے گی اور ضرور غوس بھی ساتھ چلیں گے۔ بلکہ ہم سب انہی کی چمچاتی بیوک کار میں چلیں گے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ظریف نہ سہی، ظرافت کے مواقع ضرور فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مگر انہیں ساتھ گھسیٹنے میں تفتن طبع کے علاوہ ان کی دنیا و عاقبت سنوارنے کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔ وہ یوں کہ قصبہ چاکسو سے کراچی وارد ہونے کے بعد وہ پندرہ سال سے ریل میں نہیں بیٹھے تھے اور اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ کبھی میونسپل۔ دوسے باہر قدم پڑ جائے تو اپنے کو غریب الوطن محسوس کرنے لگتے۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد بزرگوار مرتے مر گئے، مگر فرنگی کی ریل میں نہیں بیٹھے اور آخر دم تک اس عقیدے پر بڑے استقلال سے قائم رہے کہ دوسرے قصبوں میں چاند اتنا بڑا ہو ہی نہیں سکتا جتنا کہ چاکسو میں۔ مناظر قدرت کے شیدائی ہیں۔ خصوصاً دریائے سندھ کے۔ کہتے ہیں، خدا کی قسم! اس سے خوبصورت دریا نہیں دیکھا۔ وہ قسم نہ کھائیں تب بھی یہ دعویٰ حرف بحرف صحیح ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے واقعی کوئی اور دریا نہیں دیکھا۔ خدا جانے کب سے اُدھار کھاتے بیٹھے تھے۔ بس ٹوکنے کی دیر بھئی۔ کہنے لگے، ضرور چلوں گا۔ کراچی تو زرا رگستان ہے۔ بارش کا نام نہیں۔ دو سال سے کان پر نالے کی آواز کو ترس گئے ہیں۔ میں تو ساون بھادول میں رات کو غسل خانے کانل کھلا چھوڑ کر سوتا ہوں تاکہ خواب میں ٹپ ٹپ کی آواز آتی رہے۔ میرا نے ٹوکا کہ کوئٹہ میں بھی برسات میں بارش نہیں ہوتی۔ پوچھا، کیا مطلب؟ بولے، جاڑ میں ہوتی ہے۔

”ناہم“ پاک بوہین کافی ہاؤس“ میں کئی دن تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ پروفیسر قدوس ساتھ چلنے کے لیے اتنی جلدی کیسے آمادہ ہو گئے اور کوئٹہ کا نام سننے ہی



مٹان کی کوری صراحی کی طرح کیوں سنسنے لگے۔ مرزا نے کچھ اور ہی تاویل کی۔ فرمایا، قصہ دراصل یہ ہے کہ پروفیسر کے ایک دوست ان کے لیے پیرس سے سمور کے دستلے تحفہ لائے ہیں، جنہیں پہننے کے چاقو میں وہ جلد از جلد کسی ہل اسٹیشن جانا چاہتے ہیں، کیونکہ کراچی میں تو لوگ دسمبر میں بھی ملل کے کرتے پہن کر آتس کریم کھانے نکلتے ہیں۔ اس حسن تعلیل کی تصدیق ایک حد تک اس سوٹ کیس سے بھی ہوئی جس میں پروفیسر یہ دستلے رکھ کرے گئے تھے۔ اس پر یورپ کے ہوٹلوں کے رنگ برنگے لیبل چپکے ہوئے تھے۔ وہ اسے کبھی جھاڑتے پونچھتے نہیں تھے کہ کہیں وہ اتر نہ جائیں۔

اب رہے ضرغوص۔ تو رسمی تعارف کے لیے اتنا کافی ہوگا کہ پورا نام ضرغوص ایم ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سینیر ایڈووکیٹ ہے۔ ہمارے یونیورسٹی کے ساتھی ہیں۔ اُس زمانے میں لڑکے بر بنائے اخلاص و اختصار انہیں ”ضرغوص“ کہتے تھے۔ ان مخلص حلقوں میں آج بھی اسی مخفف نام سے پکارے اور یاد کیے جاتے ہیں۔ اکثر ناواقف اعتراض کر بیٹھتے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔ لیکن ایک دفعہ انہیں دیکھ لیں تو کہتے ہیں، ٹھیک ہی ہے۔ پروفیسر نے ان کی شخصیت کا تجزیہ بلکہ پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے ایک دفعہ بڑے مزے کی بات کہی۔ فرمایا، ان کی شخصیت میں سے ”بنک بلیس“ اور ”بیوک“ نکال دیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ مرزا نے جھٹ سے لقمہ دیا، ایک بد نصیب بیوی۔! سیر و سیاحت کے رسیا، لیکن ذرا کھرج کر دیکھیے تو اندر سے ٹھیٹ شہری۔ ایسا شہری جو بڑی محنت، بڑی مشقت سے جنگلوں کو ختم کر کے شہر آباد کرتا ہے اور جب شہر آباد ہو جاتے ہیں تو پھر جنگلوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بڑے وضع دار آدمی ہیں اور اس قبیلے سے ہیں جو پچانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنا ضروری سمجھتا ہے۔



زیادہ تر گارے سفر کرتے ہیں اور اسے بھی کمرۂ حالت تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ کراچی سے اگر کابل جانا ہو تو اپنے غلام کے چرہ راستے سے ہی درۂ خیبر کا راستہ پوچھنے لگیں گے۔ دو سال پہلے مرزا ان کے ہمراہ مری اور وادی کاغان کی سیر کرتے تھے اور ان کا بیان ہے کہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے حدود سے نکلنے سے پہلے ہی وہ پاکستان کا "روڈ میپ" (سڑکوں کا نقشہ) سیٹ پر پھیل کر بغور دیکھنے لگے۔ مرزا نے کہا تمہیں بغیر نقشہ دیکھے بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کراچی سے نکلنے کی ایک ہی سڑک ہے۔ بقیہ تین طرف سمندر ہے۔ بس اسی لیے تو سارا تر قوس ہے۔

اسی سفر کی یادگار ایک تصویر تھی جو ضرغوص نے کوہ شوگراں پر ایک غیش یافتہ ٹو پر بحالت رکوع کھینچوائی تھی۔ اس تصویر میں وہ دم کے علاوہ ٹٹو کی ہر چیز پر سوار نظر آتے تھے۔ لگام اتنے زور سے کھینچ رکھی تھی کہ ٹٹو کے کان ان کے کانوں کو چھو رہے تھے۔ اور چاروں کانوں کے بیچ میں ٹٹو کی گردن پر ان کی سہ منزلہ ٹھوڑی کی قلم لگی ہوئی تھی۔ اپنا سارا وزن رکاب پر ڈالے ہوئے تھے تاکہ ٹٹو پر بوجھ نہ پڑے۔ مرزا کہتے ہیں کہ کھڑی چڑھائی کے دوران کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹٹو کمر لچکا کر رانوں کے نیچے سے شک گیا اور ضرغوص کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ و شوگر گزار ڈھلوانوں پر جہاں پگڈنڈی تنگ اور دائیں بائیں ہزاروں فٹ گہرے کھڈ ہوتے، وہاں وہ خود ٹانگیں سیدھی کر کے کھڑے رہ جاتے۔ کہتے تھے، اگر مقتدر میں گر کر ہی مرنا لکھا ہے تو میں اپنی ٹانگوں کی لغزش سے مرنا پسند کروں گا، ٹٹو کی نہیں۔ یہ تصویر تین چار ہفتے تک ان کے دفتر میں "ریش" لیتی رہی۔ بعد ازاں دوسرے وکیلوں نے سمجھا بچھا کر اتر وادی کہ انجمن انسداد بے رحمی جانوران والوں میں سے کسی نے دیکھ لی تو کھٹاک سے تمہارا چالان کر دیں گے۔



(۲)

چار درویشوں کا یہ قافلہ کار سے روانہ ہوا۔ رگستان کا سفر اور نو کا یہ علم کہ پسینہ  
 نکلنے سے پہلے خشک! جبیکب آباد سے آگے بڑھے تو مرزا کو بڑی شدت سے چنوں کی کمی محسوس  
 ہونے لگی۔ اس لیے کہ اگر وہ پاس ہوتے تو ریت میں بڑے خستہ بھونے جاسکتے تھے۔ دو  
 کے کھانے کے بعد انھوں نے صراحی میں پتی ڈال کر چائے بنانے کی تجویز پیش کی جو بلا شکر  
 اس لیے رد کر دی گئی کہ سڑک سے دھواں سا اٹھ رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ضرغوص  
 کو یہی گرم پانی گرم تر ٹائروں پر چھڑکنا پڑتا تھا۔ ۱۲۰ درجہ گرمی سے پگھلے ہوئے تار کول کی  
 چھینٹیں اڑاڑ کر کار کے شیشے کو داغدار کر رہی تھیں۔ اس چھلنی میں سے جھلکتے ہوئے ہم  
 نے انگلی کے اشارے سے پروفیسر کو سات آٹھ سال کی بلوچ لڑکی دکھائی جو سر پر خالی گھڑا  
 رکھے، سڑک پر ننگے پاؤں چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اس پر نظر پڑی، پروفیسر نے برف کی  
 ڈلی جو وہ چوس رہے تھے، فوراً اتھوک دی۔ اس پر ضرغوص کہنے لگے کہ وہ ایک دفعہ  
 جنوری میں کراچی سے برف باری کا منظر دیکھنے گئے تو مری کے نواح میں برف پر پیروں  
 کے نشان نظر آئے، جن میں خون جما ہوا تھا۔ ہوٹل گائیڈ نے بتایا کہ یہ پہاڑیوں اور ان  
 کے بچوں کے پیروں کے نشان ہیں۔ پروفیسر کے چہرے پر درد کی لہر دیکھ کر ضرغوص تسلی  
 دینے لگے کہ یہ لوگ تو ”لینڈ ایکپ“ ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان میں احساس نہیں ہوتا۔ پروفیسر  
 نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہارن بجلتے ہوئے بولے، احساس ہوتا تو ننگے پاؤں کیوں چلتے؟  
 راستے کی رُوداد جو راستے ہی کی طرح طویل اور دلچسپ ہے، ہم علیحدہ رپورٹار کے  
 لیے اٹھا رکھتے ہیں کہ ہر سنگ میل سے ایک یادگار حماقت وابستہ ہے۔ ہر دست اپنا اشارہ لگانا



ہو گا کہ پروفیسر اور مرزا کے لطفِ صحبت نے چھ سو میل کی مسافت اور تکان کو محسوس نہ ہونے دیا۔ پہاڑی راستوں کے آثار چڑھاؤ پر پروفیسر کے لیے نئی چیز تھی۔ بطورِ خاص یہیں مخاطب کے فرمایا، واللہ! یہ سڑک تو ہارٹ اٹیک کے کارڈیو گرام کی مانند ہے! ہر ناگہانی موڑ پر انہیں بیگم کی مانگ اُجڑتی دکھائی دیتی اور وہ مڑ مڑ کے سڑک کو دیکھتے جو پہاڑ کے گرد سانپ کی طرح لپٹتی، بل کھاتی چلی گئی تھی۔ ضررِ غوص نے کار کو ایک سُرنگ میں سے پرو کر نکالا تو مرزا انگریز انجنیئروں کو یاد کر کے ایک دم جذباتی ہو گئے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر کہنے لگے، یہ بل اسٹیشن انگریز کی دین ہیں۔ یہ پہاڑ انگریز کی دریافت ہیں۔ پروفیسر قدوس نے دائیں کنپٹی کھجالتے ہوئے فوراً تردید کی۔ فرمایا، تاریخ کہتی ہے کہ ان پہاڑوں پر انگریزوں سے پہلے بھی لوگ رہتے تھے۔ مرزا نے کہا، بجا! مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم پہاڑ پر رہے ہیں! بالآخر نوک جھوک اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا اور سانپ کے پھن پر ایک سہرا دکھائی دیا۔ "EUREKA ! EUREKA !"

شہر میں داخل ہوتے ہی ہم تو اپنے آپ کو مقامی آب و ہوا کے سپرد کر کے بے غم ہو گئے، لیکن مرزا کی باچھیں کانوں تک کھل گئیں اور ایسی کھلیں کہ دہانے میں تر بوز کی فاش فرٹ آجائے۔ سڑک کے دونوں طرف، دیو قامت چنار دیکھ کر انہی کی طرح جھومنے لگے۔ بولے، اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔ ایک پیر کے نیچے پوری برات سو جاتے۔ یوں ہو کو لاہور میں بھی درخت ہیں۔ ایک سے ایک تناور، ایک سے ایک چھتار۔ مگر جون جولائی میں پتا تک نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے، سانس روکے فوٹو کھینچنے کے کھڑے ہیں۔ ہم بڑھ کر بولے، لیکن کراچی میں تو جو بیس گھنٹے فرحت بخش سمندری ہوا چلتی رہتی ہے۔ فرمایا، ہاں! کراچی میں پیل کا پتا بھی ملنے لگے تو ہم اسے یکے از عجائباتِ قدرت جان کر میونسپل کارپوریشن



کا شکرا کرتے ہیں جس نے یہ بیل بوٹے اُگلے تے۔ مگر یہاں اس ”نیچرل بیوٹی“ کی داد دینے والا کوئی نہیں۔ ہاتے! یہ منظر تو بالکل کرسمس کارڈ کی طرح ہے!

ہم تینوں ”یہ کرسمس کارڈ“ دیکھنے کے بجائے پروفیسر کو دیکھ رہے تھے اور وہ ”زندہ“ درختوں کو انگلیوں سے چھو چھو کر اپنی نظر کی تصدیق کر رہے تھے۔ دراصل وہ خوبانیوں کو پھل والوں کی دکانوں میں رنگین کاغذوں اور گوٹے کے تاروں سے سجا سجایا دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ خوبانیاں درختوں میں بھی لگ سکتی ہیں۔

فاضل پروفیسر تا دیر اس رُوح پر در منظر سے محظوظ ہوتے رہے بلکہ اس کے کچھ لذیذ حصے تناول بھی فرمائے۔

(۳)

پہلا مسئلہ رہائش کا تھا۔ اس کا انتخاب و انتظام پروفیسر کی ناقص رائے پر چھوڑ دیا گیا، مگر ان کی نظر میں کوئی ہوٹل نہیں جیتا تھا۔ ایک ”الٹرا ماڈرن“ ہوٹل کو اس لیے ناپسند کیا کہ اس کے غسل خانے بڑے کشادہ تھے، مگر کمرے موزی کی گور کی طرح تنگ۔ دوسرے ہوٹل کو اس لیے کہ وہاں معاملہ برعکس تھا اور فیسرے ہوٹل کو اس وجہ سے کہ وہاں دونوں چیزیں ایک ہی ڈیزائن پر بنائی گئی تھیں۔ یعنی — آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ چوتھے عالیشان ہوٹل سے اس بنا پر بھاگ لیے کہ بندہ کسی ایسے ہوٹل میں ٹھہرنے کا روادار نہیں، جہاں کے بیرے مسافروں سے زیادہ اسمارٹ ہوں۔ پھر کار پانچویں ہوٹل کے پورچ میں جا کر رُکی، جہاں ایک سائن بورڈ دو دو فٹ لمبے حروف میں



و دعوتِ طعام و قیام دے رہا تھا :

گھر کی سی غذا اور فضا

اب کی دفعہ مرزا بدک گئے۔ کہنے لگے ”صاحب! میں ایک منٹ بھی ایسی جگہ نہیں رہ سکتا، جہاں پھر وہی۔“

جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہم اُن کا مطلب سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔

چٹان میر ”جنٹل“ ہوٹل کا تھا۔ انگریزوں کے وقتوں کی یہ ترشی ترشائی سی عمارت سفید سے چکنے چکنے تنوں کی اوٹ سے یوں جھللا رہی تھی جیسے سالگرہ کا کیک! دیکھتے ہی سب لوٹ ہو گئے۔ پروفیسر نے آگے بڑھ کر اُس کے ازکار رفتہ اینکوائڈین ٹیبل سے بعد مصافحہ کراہہ دریافت کیا۔ جواب بلا سنگل روم — پچپن روپے یومیہ۔ ٹبل روم — میاں بیوی کے لیے — پچتر روپے۔ سب سنٹے میں آگئے۔ ذرا اوسا دُست ہوئے تو مرزا نے سوکھے منہ سے پوچھا

”کیا اپنی ذاتی بیوی کے ساتھ بھی پچتر روپے ہوں گے؟“

بارے رہنے کا ٹھکانہ ہوا تو سیریلٹے کی سوچھی۔ پروفیسر کو کوئٹہ بحیثیت مجرمی بہت پسند آیا۔ ”یہ بحیثیت مجرمی“ کی بیخ ہماری نہیں انہیں کی لگائی ہوئی ہے۔ دل میں فہ اس شہر نگاراں، اس سیرگاہ مغروراں کی ایک ایک ادا، بلکہ ایک ایک اینٹ پر نثار تھے۔ لیکن محفل میں کھل کر تعریف نہیں کرتے تھے، مبادا لوگ انہیں ٹورسٹ بیورو کا افسر سمجھنے لگیں چارپانچ روز بعد ہم نے تھلیے میں پوچھا، کہو! اسٹیشن پسند آیا؟ بولے، ہاں! اگر یہ پہاڑ نہ ہوں تو جگہ اچھی ہے! پوچھا، پہاڑوں سے کیا ہرج ہے؟ بولے، بقول مجاز دوسری طرف کا منظر نظر نہیں آتا۔ دراصل انہیں بے برگ و گیاہ پہاڑ دیکھ کر قد سے مایوسی ہوئی۔ چنانچہ



ایک دن کہنے لگے :

”مرزا! یہ پہاڑ تمہارے سر کی طرح کیوں ہیں؟“

”ایک زمانے میں یہ بھی دیو داروں اور صنوبروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پر بت پرست ہریالی ہی ہریالی تھی۔ مگر بکریاں سب چٹ کر گئیں۔ اسی لیے حکومت نے بکریوں کے استیصال کے لیے ایک عہد بنایا ہے اور پوری قوم شجر بکبت حکومت کے ساتھ ہے۔“

”مگر ہمیں تو یہاں کہیں بکریاں نظر نہیں آئیں۔“

”انہیں یہاں کے باشندے چٹ کر گئے۔“

”لیکن مجھے تو گلی کو چول میں یہاں کے اصلی باشندے بھی دکھائی نہیں دیتے۔“

”ہاں! وہ اب بستی میں رہتے ہیں!“

ہم نے دونوں کو سمجھایا، آج درست نہیں ہیں تو کیا۔ محکمہ جنگلات سلامت ہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ ارشاد ہوا، صاحب! محکمہ جنگلات ہے تو ہٹا کرے۔ ہاں کلین شیو پہاڑوں میں اُس کے غالباً وہی فرائض ہوں گے جو افغانستان میں بحری بیڑے کے پروفیسر یہ سنگلاخ پہاڑ دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ایسے خالص پہاڑ، جن میں پہاڑ کے علاوہ کچھ نہ ہو، دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مرزا نے بہتیرا بجایا کہ پہاڑ اور آدمی عورت و راصل آئل پیٹنگ کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا فاصلے سے دیکھنا چاہیے۔ مگر پروفیسر دُور کے جلوے کے قائل نہیں۔ بے شجر پہاڑوں سے ان کی بیزاری

\* بستی : کوئٹہ سے کوئی سو میل دُور ایک انتہائی گرم (۱۲۰-۱۱۵ ڈگری) مقام جسے کوئٹہ

کا دروازہ کہنا چاہیے، کیونکہ

ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے بستی سے گزر کر جاتی ہے



کم کرنے کی غرض سے مرزا نے ایک دن غروب آفتاب کے وقت کوہِ مُردار کے سلسلے کی وہ مشہور سُرستی پہاڑی دکھائی، جس کے ”سلوٹ“ کو دیکھنے والا اگر نظر جا کر دیکھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نازک اندام نازنین مُردہ پڑی ہے۔ اس کے پیچھے کو پھیلے ہوئے بال، کشادہ پیشانی، چہرے کا تیکھا تیکھا پر و فائل اور سینے کے تکون غور سے دیکھنے پر ایک ایک کر کے اُبھرتے چلے جاتے ہیں۔ مرزا انگلی پکڑ کے پروفیسر کو اس تصویر کے ہیچے کراتے گئے۔ موصوف اپنی آنکھوں پر دانتیں ہاتھ کا چھجا بنا کر بغور دیکھتے رہے اور اس حسین و عزیٰ منظر سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ بعد معائنہ اعلان فرمایا کہ نازک اندام نازنین مری نہیں، صرف بے ہوش ہے۔

پہاڑوں کی تہی دامن سے گلہ دو دن بعد دُور ہوا جب سب منزلیں مارتے قائمِ عظم کے محبوب ہل اٹیشن زیارت (آٹھ ہزار فٹ) پہنچے۔ جہاں تک پروفیسر کی عینک کام کرتی تھی، ہر اہی ہر انظر آ رہا تھا۔ بستر بند کھلنے سے پہلے فاضل پروفیسر نے ایک پہاڑی سر کر ڈالی اور اس کی چوٹی پر پہنچ کر تصویریں بھی اُتروائیں، جن میں ان کے ہونٹوں پر وہ فاتحانہ مُسکراہٹ کھیل رہی تھی، جو نوابین و مہاراجگان کے چہروں پر مُردہ شیر کے سر پر رائفل کا کنارہ کھڑو ٹو کھینچواتے وقت ہوا کرتی تھی۔ وہ اس سرکش چوٹی کی بلندی آٹھ ہزار پچاس فٹ بتاتے تھے۔ اور اس میں قطعی مبالغہ نہ تھا۔ اس لیے کہ سطح سمندر سے اس کی بلندی اتنی ہی تھی، گو کہ زمین کی سطح سے صرف پچاس فٹ بلند ہو پائی تھی۔ جھوٹ سچ کا حال اللہ جانے، مگر مرزا کا حلفیہ بیان ہے کہ کوہِ مفتوحہ کی چوٹی پر قدم رکھنے کے پانچ منٹ بعد تک فاتح پروفیسر کے ہانپنے کی آواز پچاس فٹ نیچے ”بیس کمیپ“ میں صاف

✱ سلوٹ: چہرے کے ایک رخ کی آؤٹ لائن، جس میں سیاہ رنگ بھرا ہو۔







چکی تو ”ریچھ“ کہہ کر وہیں سجدے میں چلے گئے۔ مرزا کو بھی ہدایت کی کہ جہاں ہو وہیں بیٹھ جاؤ اور سگرٹ بجھا دو۔ مرزا پہلے ہی برفانی ریچھوں کے قصے سن چکے تھے۔ یوں بھی سیدھے سادے مسلمان ہیں، لہذا ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کیا، بلکہ عمل کے بعد بھی آنکھ بند ہی رکھی۔ لیکن کچھ دیر بعد جی کڑا کر کے اُسے کھولا تو پوچھنے لگے ”مگر یہ میں میں کیوں کر رہا ہے؟“ پروفیسر نے سجدے ہی میں ذرا دیر کان لگا کر سُنا اور پھر اچھل کر کھڑے ہو گئے فرمایا ”ارے صاحب! آواز پر نہ جلیے۔ یہ بڑا مگڑا جانور ہوتا ہے!“

(۴)

ضرغوص جس اہتمام و انصرام سے سفر کرتے ہیں وہ دیدنی ہے۔ محمد شاہ زنگیلے کے متعلق تو سنا ہی سنا تھا کہ جب اس کی فوج ظفر موج نادر شاہ درانی سے لڑنے نکلی تو جرنیل حسب مناصب بھوٹی، بڑی، منجمولی پالکیوں میں سوار احکام صادر کرتے جا رہے تھے اور آگے آگے خدمت گار اُن کی آبدار تلواریں اٹھاتے چل رہے تھے۔ من جملہ دیگر ساز و سامان عرب کے کئی چھکڑے مہندی سے لدے جلو میں تھے تاکہ سپاہی اور سپہ سالار اپنے ہاتھ پیروں اور بالوں کو رن میں جانے سے پہلے شاہ پسند رنگ میں رنگ سکیں۔ مرزا سے روایت ہے کہ سفر تو خیر سفر ہے۔ ضرغوص شہر میں بھی اتنی وضعداری برتتے ہیں کہ ان کا بڑا لڑکا کرکٹ کھیلتا ہے تو چہرہ اسی چھتری لگاتے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے۔ غالب کی طرح ضرغوص تیغ و کفن ہی نہیں، تحفہ غسل اور کافور تک باندھ کر لے جانے والوں میں سے ہیں۔ لحاف اور مٹل کا کرتا، نمک اور کوکا کولا، تاش اور کیسا نوا (اُن کا سیاہ کتا)، ڈز جیکٹ اور ”پک وک پیپر“، بندوق اور فرسٹ ایڈ کا بڑا کبس۔



غرضیکہ کونسی غیر ضروری چیز ہے جو دوران سفر ان کی زنجیل میں نہیں ہوتی؟ البتہ اس مرتبہ واپسی پر انہیں یہ قلق رہا کہ سفر یوں تو ہر لحاظ سے کامیاب رہا، مگر فرسٹ ایڈ کا سامان استعمال کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔

ان کے اندر جو شہری بسا ہوا ہے، وہ کسی طرح اور کسی لمحے ان کا پیچا نہیں چھوڑتا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کبھی بادام کے تنے پر چاقو کی نوک سے اپنا نام اور تاریخ آبد لکھواتا ہے اور کبھی پہاڑی چکور کے شوخ رنگوں کی داد باتیں بور کی گولی سے دیتا ہے۔ کبھی گونجتے گرجتے آتشروں کے دامن میں ”راک اینڈ رول“ اور ”ٹوئسٹ“ کے ریکارڈ بجا کر سیٹوں سے شکست کرتا ہے اور کبھی جنگلوں کی سیر کو یوں نکلتا ہے گویا ”ایفنی“ یا ”مال“ پر شام کے شکار کو نکلتا ہے۔ مرنے بارہا سمجھایا، دیکھوا پہاڑوں، جنگلوں اور دیہاتوں میں جانا ہو تو یوں نہ نکلا کرو۔ یوڈی کلون لگاتے، سگار منہ میں، ہر سانس بستر میں بسا ہوا، باتوں میں ڈرائنگ روم کی مہک۔ اس سے دیہات کی بھینی بھینی خوشبوئیں دب جاتی ہیں۔ وہ سہمی سہمی خوشبوئیں جو یاد دلاتی ہیں کہ یہاں سے دیہات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ وہ سرحد جہاں سدا خوشبوؤں کی دھنک نکلی رہتی ہے۔ کچے دودھ اور تازہ کٹی ہوئی گھاس کی میٹھی میٹھی باس، چھتروں، کھیر بلوں سے چھن چھن کر نکلتا ہوا آپلوں کا کرپوا کرپوا دھواں، گھم گھم چلتی چلتی سے پھسلتے ہوئے مکتی کے آٹے کی گرم گرم سگند کے ساتھ ”وہ کنوار پتے کی تیز مہک“، جوہڑ کی کائی کا بھیکا چھپلا ندا جھونکا، سرسوں کی بالیوں کی کٹیلی مہکار، بھیر بکریوں کے ریوڑ کا بھیکا، انگاروں پر نکلتی ہوئی روٹی کی سیدھی معدے میں گھس جانے والی لپٹ اور ان سب میں رچی ہوئی، ان سب میں گھلی ہوئی کھیتوں اور کھلیانوں میں تانبا سے تپتے ہوئے جسموں



کی ہزاروں سال پرانی مہک — یہ زمین کے وحشی سانس کی خوشبو ہے۔ زمین کو سانس لینے دو۔ اس کی خوشبو کے سوتے خون سے جلتے ہیں۔ اسے مساموں میں سہج سہج جذب ہونے دو۔ اسے ہونا سگار اور ڈیوڈورنٹ سے نہ مارو کہ یہ ایک دفعہ جس بستی سے روٹھ جاتی ہے پھر لوٹ کر نہیں آتی۔ تم نے دیکھا ہوگا، چھوٹے بچوں کے جسم سے ایک پراسرار مہک آتی ہے۔ کچی کچی، کوری کوری، جو بڑے ہو کر اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ یہی حال بستیوں کا ہے۔ شراب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اُن میں اپنی کوئی خوشبو باقی نہیں رہی۔

پروفیسر قدوس کو ایسی باتوں میں ”لا دے اک جنگل مجھے بازار سے“ والا فلسفہ نظر آتا ہے۔ جو سفید کالر والوں کی خوشبودار فراریت کی پیداوار ہے۔ کہتے ہیں شہری غزالوں کا نافہ اُن کے سر میں ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بحث میں چاروں طرف سے شہ پڑنے لگے تو وہ مزا ہی کے کسی نیم فلسفیانہ فقرے کی فصیلوں کے پیچھے دبک جاتے ہیں اور اس لحاظ سے اُن کا رویہ ٹھیٹ پر و فیسر نہ ہوتا ہے۔ یعنی اصل متن کے بجائے محض فٹ نوٹ پڑھنا کا رِثواب سمجھتے ہیں۔ لیکن ضرغوص کا عمل صحت مندانہ نہ سہی، صحت افزا ضرور ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ مناظر قدرت کی داد اپنے معدے سے دیتے ہیں۔ جہاں موسم خوشگوار اور منظر خوش آئند ہوا، اور ان کی سمجھ میں اس سے لطف اندوز ہونے کا ایک یہی طریقہ آیا کہ ڈٹ کر کھایا جائے اور بار بار کھایا جائے۔ اور اس خوشگوار شغل سے جو تھوڑا سا وقت بچ رہے اُس میں رمی کھیلی جائے۔ یہاں بد قسمتی سے موسم ہمیشہ اچھا رہتا تھا۔ اس لیے روزانہ کھانے کے درمیانی وقفوں میں رمی کی بازی جمتی۔ مخلص دوستوں نے اس طرح پورے چھ ہفتے ایک دوسرے کو کنگال بنانے کی مخلصانہ کوششوں میں گزار دیے۔

\* ڈیوڈورنٹ : قدرتی بُو کو زائل کرنے والی دوائیں۔



ضرغوص تو آنکھ بچا کر پتا بدلنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ یہ نہ کریں تب بھی پروفیسر ہر جتنی دالے کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔ بہر صورت ہم نے تو یہ دیکھا کہ ان گنت شاداب لمحے جو چڑیا اور چنار کے نظارے میں صرف ہو سکتے تھے، وہ دونوں نے چڑیا کے غلام اور پان کے چوڑے پر نظریں جمائے گزار دیے اور کبھی پلٹ کر پربت پہاڑوں پر ڈوبتے سوج اور چڑھتے چاند کا جلال نہیں دیکھا اور نہ کبھی آنکھ اٹھا کر اس روپ نگر کی آن دیکھی جس کے سر سے زلزلے کی قیامت گزر گئی، مگر جہاں آج بھی گلاب دہکتے ہیں۔ رہ گزاروں کی بھی ور خساروں پر بھی۔ ان کی کنپٹیوں پر اب روپہلی تار جھلملانے لگے ہیں مگر وہ ابھی اس لذت آوارگی سے آشنا نہیں ہوئے جو ایک پل میں ایک جگہ کا رس بھر دیتی ہے۔ ابھی انھوں نے ہر پھول ہر چہرے کو یوں جی بھر کے دیکھنا نہیں سیکھا، جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں، پھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ ایسے ہی کو ہساروں اور وادیوں سے گزرتے ہوئے بابر نے اپنی تزک میں کتنی مایوسی کے ساتھ لکھا ہے کہ جب ہم کسی دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالتے ہیں تو ہم اور ہماری مغل فوج اپنے خیموں کا رخ دریا کے دلکش منظر کی طرف رکھتے ہیں، لیکن ہماری ہندی فوج اپنے خیموں کی پیٹھ دریا کی طرف کر لیتی ہے۔ یہاں ضرغوص کی کم نگہی دکھانی مقصود نہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ کراچی پہنچ کر انھوں نے اپنی کھینچی ہوئی رنگین فلمیں اسکرین پر دیکھیں تو دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے، یار! کمال ہے! ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوٹہ خوبصورت جگہ ہے!

(۵)

ضرغوص خود کو ہیون سانگ اور ایڈمنڈ ہیری سے کم نہیں سمجھتے۔ بابر دعاتے



سیاحی کیفیت یہ ہے کہ ایک دن مرزا نے پوچھا، یار! کن چن چنگا بھی دیکھی؟ ارشاد ہوا نہیں۔ ہم چینی فلمیں نہیں دیکھتے۔ مگر کون سی فلم میں کام کر رہی ہے؟ مرزا بھی ان کے ہمراہ دوسری مرتبہ اپنا ملک دریافت کرنے نکلے تھے، مگر جہاں گئے، جدھر گئے، خود ہی کو مقابل پایا۔ آخر دو مہینے جغرافیہ میں سوانح عمری کا رنگ بھر کے لوٹ آئے۔ کہنا پڑے گا کہ ایک کا دل اور دوسرے کی آنکھیں شہری ہیں اور اس کی تصدیق قدم قدم پر پچھلے سفر کی رُوداد سے ہوتی ہے۔ آپ بھی سُنئے، کبھی ان کی، کبھی اُن کی زبانی۔ ضرغوص کا بیٹا ہے کہ تیورس کے سال مرزا وادی کاغان میں گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر فیروزی رنگ کی منجمد جھیل، میلوں تک پھیلے ہوئے گلشیر اور برف پوش پہاڑ دیکھ کر بہت حیران ہوئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ملائی کی برف کے علاوہ بھی کوئی برف ہو سکتی ہے اور وہ بھی مفت! کم و بیش اتنی ہی شدت کا عالم جذب دریائے کنہار دیکھ کر انھوں نے اپنے اوپر طاری کر لیا۔ اس تلملاتی، جھاگ اڑاتی، کوہستانی ندی کے پل پر دیر تک دم سا دھریا تے حیرت میں غوطہ زن رہے۔ آخر ایک دُر خوش آب لے کر ابھرے۔ فرمایا، کس قدر خوبصورت جھاگ ہیں! بالکل لکس صابن جیسے! حاضرین نے اس اشتہاری تشبیہ کا مذاق اڑایا تو تنک کر بولے، صاحب! میں تو جب جانوں کہ درڈ زور تھ کو درمیان میں لائے بغیر آپ نیچر پر دو جملے بول کر دکھادیں۔

مرزا بطور جواب آں غزل، اسی مقام اور اسی گھڑی کا ایک اور سماں کھینچتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مردان خوش اوقات کس کس طرح مناظر قدرت کی منزلت بڑھاتے ہیں۔ (تصویر میں جگہ جگہ ضرغوص نے بھی شوخ رنگ لگا دیے ہیں۔) یہ مقام بالا کوٹ کے دامن میں اس کنارے پر واقع ہے، جہاں ندی دو بھاری پہاڑوں کے درمیان نرنگی کی



کمر کی طرح بل کھا گئی ہے۔ اس سے یہ کرامت منسوب ہے کہ جہانگیر کے ہمراہ اس راستے سے کشمیر جاتے ہوئے نور جہاں کی آنکھوں میں سوزش ہوئی۔ جہانگیر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ شاہی طبیب کے سمرہ و کحل و ضماد سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ناگاہ ایک درویش باصفا کا ادھر سے گزر ہوا۔ اُس نے کہا جیسے ہی چاند اس صنوبر کے اوپر آئے، ملکہ مدی کا پانی انجمل میں بھر کے اس میں اپنا چہرہ دیکھے اور اسی سے سات دفعہ آنکھیں دھوئے مولا اپنا فضل کرے گا۔ نور جہاں نے ایسا ہی کیا اور تار اسی آنکھیں ہو گئیں۔ اُس دن سے اس مقام کا نام نہیں سکھ ہو گیا اور ادھر سے گزرتے ہوئے آج بھی بہت سے ہاتھ موتی سا پانی چٹو میں بھر کے اس البیلی ملکہ کی یاد تازہ کر جاتے ہیں۔

ہاں! تو یہ مقام تھا اور شروع برسات کی رات! صبح اسی جبکہ ایک تاریخی فلم کی شوٹنگ کے دوران ہیروئن کے پیر میں موج آگئی تھی اور چراغ جلے تک ادبی بالاکوٹ گلہروہ باشندہ جو اُس دن صاحب فراش نہیں تھا، اس گھوڑے کو دیکھنے آیا، جس سے ہیروئن گری یا گرائی گئی تھی اور اس وقت جب رات کی جوانی ابھی نہیں ڈھلی تھی، یہاں اسی فلم کے پروڈیوسر (جن کا منہ مہمیشی سے سشن جی اور سشن جی سے ہائی کورٹ اور ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک ضرغوص نے بلا مختانہ و محنت لڑا اور ہارا تھا) ضرغوص کی خاطر تواضع میں نیچے جا رہے تھے۔ ساتھ شہد جیسی رنگت کے بالوں والی ہیروئن بھی تھی جو ٹرانزسٹر ریڈیو پر ”چا چا چا“ کی دھن پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی غیر موقوف ٹانگ تھرا رہی تھی اور مرزا کے الفاظ میں ”اوپن ایئر ہوسٹس“ کے فرائض بڑی تن دہی سے انجام دے رہی تھی۔ ضرغوص فیروزے کی انگوٹھی سے ”پک وک پیپر“ کی جلد پر تال دے رہے تھے۔ ریڈیو پر کوئی گرم گیت آتا تو سب کے سب سر ملا کر اتنے زور سے ڈکرانے لگتے کہ اصل گانا



ذرا سنبائی نہ دیتا۔ صرف ناپسندیدہ گلے خاموشی اور توجہ سے سُننے گئے۔ البتہ مرزا شرم  
 ہی سے بوجہ سنجیدگی و سردی خاموش تھے۔ انہیں جب زیادہ سردی محسوس ہونے لگتی تو  
 بے اختیار ان مہیب مشعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے، جو بیس میل دور پہاڑوں پر ایک  
 مہینے سے رات ہوتے ہی روشن ہو جاتی تھیں۔ ایک مہینے سے کاغان کے جنگل دھڑو دھڑ  
 جل رہے تھے اور دور دور سے سیاح صنوبروں کی آگ دیکھنے لائے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں  
 چاروں طرف تہ در تہ تاریکی تھی، جس میں پہاڑی جگنو جا بجا مسلمانوں کی اُمیدوں کی طرح  
 ٹٹمارہے تھے۔ مرزا نظریں نیچی کیے رس بھری گندیریاں چومتے رہے۔ تھوڑے تھوڑے  
 وقفے سے ضرغوص اپنی کالکی ہیڈ لائٹ جلا دیتے اور سائلوں کی رات اپنے راز سپرد کر کے  
 چند قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ اُن کے سونے کے دانت سے شعاعیں پھوٹنے لگتیں اور  
 کیسانو وا کی شب تاب آنکھوں کے چراغ جل اُٹھتے۔ کچھ اور سپکیر بھی جنہیں روشنی نے  
 رات کی چٹان چیر کر تراشا تھا، نظر کے سامنے کوئد جاتے

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے جوتے

اس کوئدے میں ندی جھا جھم کرنے لگتی۔ جیسے ٹشو کی ساری۔ (معاف کیجئے یہ تیر  
 بھی اسی ترکش کا ہے۔)

سامنے مرزا خاموش زانوئے تہذوئے کیے بیٹھے تھے۔ کچھ برفانی ہوا، کچھ گندیری  
 کا اثر۔ اُن کا ہاتھ اپنی ناک پر پڑا تو ایسا لگا جیسے کسی دوسرے کی ہے۔ پھر ندی کے پانی  
 میں ہاتھ ڈالا تو محسوس ہوا، گویا پگھلی ہوئی برف ہے۔ اور یہ اس لیے محسوس ہوا کہ وہ دھما  
 پگھلی ہوئی برف تھی، جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بلیک اینڈ وائٹ کی دوسری توہل  
 کی گردن مرزا کی ٹائی سے باندھ کر ندی میں ڈال دی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے پر وڈیو سر



صاحب کو ایک شمشین گلاس کے کنارے پر لپ اسٹک کا گمان گزرا تو اتنا حصہ اپنے  
 دانستوں سے توڑ کر کٹر کٹر چبانے لگے اور اب وہ اندھیرے میں سگرٹ کا کش لیتے تو دہانے  
 کے دونوں کونوں پر جیتے جیتے خون کی دھاریں چمک اٹھتی تھیں۔ گنڈیریوں سے فارغ ہو کر  
 مرزا اس منظر کو آنکھوں سے پیسے جا رہے تھے، جن میں اب گلابی ڈورے ابھر آئے تھے،  
 جو غالباً نیند کے ہوں گے۔ اس لیے کہ گنڈیری میں اگر نشہ ہوتا تو مولوی گنتے لے کر گنڈیری  
 کھانے والوں کے پیچھے پڑ جاتے۔ اُن کے طور بے طور ہوتے دیکھے تو ضرر غوص نے شا  
 جھنجھوڑ کر پوچھا، مرزا! تم نے کبھی دہسکی پی ہے؟ خمار آؤ آنکھیں کھولتے ہوئے بولے  
 پی تو نہیں، مگر بوتل سے ایسی بو آتی ہے جیسی ان کے منہ سے۔ بالکل ٹنکیچر آئیڈین جیسی۔ یہ  
 کہہ کر تصدیق طلب نظروں سے پروڈیوسر کو دیکھنے لگے، جو اس ٹنکیچر آئیڈین سے اپنے منہ اور  
 دل کے زخموں کو ڈس انفکٹ کر رہے تھے۔ یہ شغل اس وقت تک جاری رہا، جب تک  
 نہ پیئے والوں نے نیند سے بے حال ہو کر اول فول بکنا شروع نہ کر دیا اور اواخر ماہ کی چاندنی  
 میں فراز بالا کوٹ پر اس مقبرے کے خطوط دیکھنے لگے، جہاں سو اسو سال پہلے اسی دادی  
 اسی رت اور اترتے چاند کی انہی تاریخوں میں ایک جیلے نے اپنے خون سے اپنی  
 قوم کے داغوں کو دھویا تھا اور جہاں آج بھی خدا کے سادہ دل بندے نسوار کی نذر  
 چڑھا کر مرادیں مانگتے نظر آ جاتے ہیں۔

(۶)

بات ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ جا پہنچی۔ دکھانا صرف یہ تھا کہ پہاڑ پر زندگی



ہر ڈھنگ اور ہر ڈھب سے گزاری جاسکتی ہے۔ نہیں کر، رو کر یا اکثریت کی طرح سو کر۔  
 مرزا کسی گھربند نہیں۔ کچھ نہیں تو چوری چوری بگیم ضرغوص کے محبت اور املا کی غلطیوں  
 سے بھرے ہوئے خط ہی پڑھتے رہتے۔ مگر ایک دن ایک عجیب رنگ میں پاتے، بلکہ  
 پکڑے گئے۔ دیکھا کہ مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے ٹوتھ پیسٹ سے کیرم بورڈ پر کچھ پیسٹ  
 کر رہے ہیں۔ خیر، ٹوتھ پیسٹ کے استعمال پر تو ہمیں کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ  
 سن چکے تھے کہ ابٹرکٹ آرٹسٹ (تجربیدی مصور) تصویر پر نیل پائش اور فنانل تک  
 لگانے سے نہیں چوکتے اور ایک صاحب ایسے بھی گزرے ہیں، جنہوں نے کینوس پر  
 گھوڑے کا نعل اپنے کٹے ہوئے ناخن اور اکلوتی پتلون کے ساتوں ٹن ماڈل کی چوپی  
 ہوئی گم سے چپکا کر بغدادی جم خانہ پرانہ حاصل کیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آرٹسٹوں  
 کی صحبت میں رہتے رہتے ہم ایسی باتوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ ٹھٹھیرے کا کبوتر مالو  
 سے نہیں اڑنا۔ لیکن اس وقت پریشانی جو ہوئی تو اس بات سے کہ ہماری رسمی تعریف کو  
 سچ سمجھ کر وہ ہمیں سے اس خوش ذائقہ تصویر کا عنوان پوچھنے لگے۔

”عنوان میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو تصویر ہوتی ہے، تصویر!“ ہم نے

ٹالنا چاہا۔

”پھر بھی۔ کیا نظر آتا ہے تمہیں؟“ وہ بھلا جھوٹے والے تھے۔

”نظر تو آتا ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا۔“

”پکاسوتے بھی کسی نے کہا تھا کہ صاحب! آپ کی تصویریں سمجھ میں نہیں

آتیں۔ اُس نے بڑا پیارا جواب دیا۔ کہنے لگا، چینی زبان آپ کی سمجھ میں نہیں آتی، مگر  
 بچاس کروڑ آدمی اسے بولتے ہیں۔ کیا سمجھے؟“



”لیکن یہ تصویر تو پکاسو کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہم نے کہا۔“

”بلا سے نہ آتے۔ ایک رفاہی پینٹنگ سن و کمال کی داد لینے والی رفاہ

کے پاس نہیں جاتی۔ داد تو تماشائیوں سے ملتی ہے۔“ رائے کہا۔

انھوں نے بقول شخصے عالم بالا کی بات کو بالآخر نے تک پہنچا کر سمجھ لیا۔

مخصوص کی طرح مرزا بھی ہل اسٹیشن کو ایک پیدائشی شہری کی پیار بھری نظر سے

دیکھتے ہیں اور نظر بھی ایسے شہری کی، جس کی ولادت اور پہلی علالت کی تاریخ ایک ہی ہو۔

خیر مرزا تو ہمارے ہم جلیں دوسرا شہرے، جن کے گھر و رشتے سے ہم اس طرح واقف

ہیں جیسے اپنی متعلق سے۔ لیکن اس دفعہ ہمیں مخصوص اور ہل اسٹیشن دونوں کو بہت قریب

سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا اگر آنکھیں دے تو انہیں استعمال

کرنے کے مواقع بھی دے۔ ورنہ حیف ہے ایسی زندگی پر۔ لیکن ہل اسٹیشن پر۔۔۔ خواہ

وہ مری ہو یا مسوری، اوٹاکسٹ ہو یا کوئٹہ۔۔۔ زندگی بیماری آپ کی طرح بے مقصد

نہیں ہوتی۔ اس کا ایک مقصد ایک طبع نظر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سدا شہان سڑکوں پر وہ

فیشن پر ٹیڈ دیکھی جاتے جس میں ہر سال آئندہ سال گھرانوں کی نا آسودہ ہو بیٹیاں دھن دھن

تن کی بازی لگا دیتی ہیں۔ انھی سڑکوں پر کالی کافی اور آلو کی ہوائیوں پر گزارہ کرنے والے

اویب سگیا قی زبان میں ایک دوسرے کو خونیں انقلاب پر اکساتے ہیں۔ انھی سڑکوں پر

اپنے گھران میں برگد اگلنے والے اٹکچوئل کسی خوبصورت لڑکی کو شرفِ زہدیت بخشنے

کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اُدھر خوبصورت لڑکی چراغِ نرخی زیبائے اس تماشائی

سڑکوں کہ جلد از جلد کسی بوڑھے لکھ پتی کی بیوہ بن جاتے! یہ سو فمز یہ شہا گارت ہر گز

پہر سال مٹاتی جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ سبزہ نرستہ برف کا کفن پہن کر سو جاتے



چناروں کی آگ سرد اور قہر خانے ویران ہو جائیں۔ مویشی میدانوں میں اترنے لگیں اور  
 سڑکوں پر کوئی ذی روح نظر نہ آئے، بجز ٹورسٹ کے — اس سے پہلے کہ موسم  
 گل بیت جائے، بہت سے ہاتھوں کی تیسری انگلی میں انگوٹھیاں جگمگانے لگتی ہیں۔  
 اگرچہ چھ غصے کے سرے کے پھول دو دفعہ کھلنا کیا، مگر جاچکے ہیں، مگر اب بھی سڑک پر ڈھیر  
 سارے چھ پرچہ۔ بے دیکھ کر ان کا حال ایسا ہوتا ہے جیسا کھلونوں کی دکان میں تھیم بچے کا!  
 اس سونمبر کے پہلو پہ پہلو ہل اسٹیشن پر سارے ملک کے لاعلاج رُوسا اور  
 متمول لائندوں کا عظیم اٹھان سالانہ میلہ لگتا ہے جس میں وسیع پیمانے پر تبادلہ امراض  
 ہوتا ہے۔ آپ نے شاید سنا ہو کہ بنارس میں جو اپنی صبح اور ساریوں کے باوجود ایک  
 پورے راستہ پر عیشیت سے بھی مشہور ہے، سارے ہندوستان کے ضعیف الاعتقاد بوڑھے  
 مرنے کے لیے کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور بہت جلد دلی مرا دپاتے ہیں۔ جو بیمار اپنی قوت  
 ارادی کی کمزوری کے سبب خود کو مرنے کے لیے تیار نہیں کر پاتے، وہ قریب ترین ہل اسٹیشن  
 کا رخ کرتے ہیں۔ ہمارے مرزا صاحب کا ثانی الزکر (بیمار برادری) سے کتنا دیرینہ تعلق ہے  
 اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیس برس پہلے آئی۔ سی۔ ایس کے مُقابلے  
 کے امتحان میں اول آنے کے بعد ان کا ڈاکٹری معائنہ ہوا تو پتہ چلا کہ دانٹوں کے علاوہ  
 اور کوئی چیز ٹھیک نہیں۔ گو کہ برادری کے رُکن کی حیثیت سے ہم خود بھی اپنی صحت کی  
 طرف سے ایک بوجھ غافل نہیں، تاہم ابھی یہ نوبت نہیں آئی کہ ڈانٹوں کی گولی حلق سے  
 اترنے سے اپنے بازو کی پھلیاں پھلا پھلا کر دیکھنے لگیں۔ لیکن مرزا کا یہ روزِ تیرہ کا معمول  
 سامراجی گمانیں بھنم کرنے کے لیے شام کو مانگے مانگے کی چھڑی گھماتے ہوئے نکل جاتا۔  
 دوستانہ کی طرح یہ سڈل چھڑی بھی پروفیسر کے دوست پیرس سے لاتے تھے۔ اس



پرفرنج ایجنٹس برٹشیت بارو کی ٹانگ کا بالائی حصہ بطور دستہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سہارے پروفیسر نے وہ ٹیلا ”فتح“ کیا، جس کی سرکوبی کا مفصل حال پہلے آچکے ہیں۔ اسی کے ذریعے وہ اندھیری راتوں میں اپنے اور گستاخ کتوں کے درمیان ایک باوقار فاصلہ قائم رکھتے ہیں اور اب اسی کو ہلاتے سہلاتے ہوئے مرزا جناح روڈ کی ہر تھیری دکان میں (جو دواؤں کی ہوتی تھی) دڑانہ گھستے چلے جاتے۔ کاؤنٹر کے پاس استاد مشین میں کھوٹی اکتی ڈال کر اپنا وزن لیتے اور ادس دواؤں کے اضافے پر مقامی آب و ہوا کی شان میں قصیدے پڑھتے لوٹتے۔ ایک دن ہم نے کہا، دیکھو، دواؤں کی یہ دکان کتنی چلتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک خوش پوش خواتین کا تانتا بندھا رہتا ہے، مگر تمہیں یہاں ملتے کبھی نہیں دیکھا۔ کہنے لگے، تو بہ کیجیے صاحب! معلوم ہوتا ہے اس کی مشین خاص طور پر عورتوں کے لیے بنوائی گئی ہے۔ ایک دن تھلا تو گل چالیس پونڈ اُترا۔ دھک سے رہ گیا۔ سیٹھ سے جا کر شکایت کی ”یہ کیا زیادتی ہے؟“ خدا کی قسم کھاکے بولا ”آپ کے ساتھ دشمنی تھوڑا ہی ہے۔ سبھی کو پچاس پونڈ کم بتاتی ہے! اس کے بعد اس بے ایمان کھوٹی اکتیوں کی ڈھیری میں سے مرزا کو ایک اکتی واپس کرنی چاہی، جسے انھوں نے ازراہ اخلاقی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بھلا مرزا ایسی دکان میں جا کر سیروں بلکہ منوں مایوسیوں کیوں مول لینے لگے وہ تو ان صحت پسندوں میں سے ہیں جو ٹھلنے بھکیں تو قدموں کی گنتی رکھتے ہیں اور متوہما لقمہ لینے سے پہلے اس خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لگا لیتے ہیں جو اس سے بننا چاہیے۔ مگر نہیں بنتا! اُن کے تغذیاتی پیانے کی رُو سے کالے ہرن کی کلجی ہیں ایک سالہ اونٹ کی غذائیت ہوتی ہے۔ اور ایک پہاڑی چکور میں ہرن کے برابر لیکن



کوئٹہ کی ایک خوبانی پورے تین چکوروں کے برابر ہوتی ہے و علیٰ ہذا القیاس۔ ایک دن اپنے صاحب ڈیڑھ دو درجن سالم اونٹ درخت سے توڑ کر کچر کچر کھاتے اور جھومتے جھاتے بلوے سے پاس راتے۔ کہنے لگے صاحب! یہ شہر تو اس قدر پر فضا ہے کہ کھا کھا کے پنا تو دوالہ نکلا جا رہا ہے۔ کھانا حلق سے اتر نہیں کہ ہضم۔ ہم نے کہا، اس سے فائدہ بھلے کیجئے نہیں؟ ٹورسٹ بی بیوں بے کاری سے بچنے کے لیے دن بھر بوسوٹر شاسٹ سٹی رہتی ہیں و تیار ہونے سے پہلے تنگ ہو جاتے ہیں۔ شام کو چاتے اور چٹوڑے کے ساتھ ٹیبلٹ ڈاڑھ دیتی ہے۔ پھر ہر چیز ارزاں ہر چیز خالص۔ حد یہ کہ "اسکینڈل" میں بھی ٹھوٹ کی ملاٹ نہیں۔ کراچی میں خالص دودھ تو بڑی بات ہے پانی بھی خالص نہیں ملتا۔ اس میں بی دودھ کی آمیزش ہوتی ہے۔ مگر یہاں دکاندار عادت ہی اس قدر مستحبابیچتے ہیں۔ اسی لیے بعض ٹورسٹ سمجھتے ہیں کہ چھوٹا شہر ہے پھر کوئٹہ کی فوقیت کیسے بعد دیکھو گے دنیا کے نو سرے شہروں پر ثابت کرنے لگے:

"لاہور؟"

"کوئٹہ سے اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر کے مہینے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیے جائیں تو واللہ! لاہور کا جواب نہیں!"

"روم؟"

"ایکسپریس خبرستان! زمین کے نیچے کی آبادی، اوپر کی آبادی۔ یہ کہیں آبادی۔ سو سو تار مٹی کھنڈر، سو اُن میں چمکاوڑیں اور امریکی ٹورسٹ سپر کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے نہیں کہا تھا کہ روم کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جو



اپنی نانی کی لاش کی نمائش کر کے روزی کھاتا ہے۔“

”مری، ملکہ کو ہسار مری؟“

”صاحب! جلوہ گرمی میں کوئٹہ سے کم نہیں ۵  
وہی نقشہ ہے دلے اس قدر آباد نہیں“

”اُوز دلی؟“

”شہر بُرا نہیں۔ مگر غلط ملک میں آباد ہے۔“

”جنیوا، صحت گاہِ عالم؟“

”صاحب! مرنے کے لیے اس سے زیادہ پُر فضا مقام روتے زمین پر

نہیں۔“

”کراچی کے متعلق کیا رائے ہے حضور کی؟“

”بہت اچھی! اگر آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دیکھیں تو کراچی کی ہر چیز

سیدھی نظر آئے گی۔“

”یار! تم کراچی کے ساتھ صریحاً زیادتی کرتے ہو۔“

”ہرگز نہیں! میں کراچی کے حقوق کے لیے ہمیشہ لڑتا رہوں گا۔ اسی لیے میں

ابالیاں کراچی کے اس مطالبے کی شد و مد سے حمایت کرتا ہوں کہ بلیر کے پل اور سڑک

کی مرمت ہونی چاہیے۔ ضرور ہونی چاہیے اور جلد ہونی چاہیے تاکہ کراچی سے نکلنے میں

آسانی رہے۔“

”یہی بات ہے تو تم واپس کیوں جا رہے ہو؟“

”مگر (انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے) ایک بات ہے۔ کراچی والے آگے



ہو کر کراچی کی بُرائی کرتے ہیں، لیکن کوئی اور اُن کی ہاں میں ہاں ملا دے تو خفا ہو جاتے ہیں۔ بس اسی ادا پہ پیار آتا ہے۔“

پھر کوئٹہ کی برتری ثابت کرتے کرتے بے دھیانی میں کہنے لگے ”ہائے! یہ عظیم شہر اگر کراچی میں ہوتا تو کیا بات تھی!“

مرزا نے اتنا کہا اور دایاں ہاتھ پھیلا کر اپنا سینہ مچھلایا اور پھر اول الذکر کو آخر الذکر پر مارا۔ ایک آہ سرد کھینچی اور خاموش ہو گئے۔

اُن کے رخساروں پر خونِ صالح کے وہ چند قطرے چمک رہے تھے، جنہیں آتشِ روزگار نے بہت جلد خشک کر دیا۔

(اپریل ۱۹۶۳ء)



## باتی فول کلب

چار مہینے ہونے لگے تھے۔ شہر کا کوئی لائق ڈاکٹر بچا ہو گا جس نے ہماری مالی تکالیف میں حسب لیاقت اضافہ نہ کیا ہو۔ لیکن باتیں کہنی کا درد کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ علاج نے جب شدت پکڑی اور مرض نے سچیدہ ہو کر مفلسی کی صورت اختیار کر لی تو لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب سے رجوع کیا جو صرف مایوس اور لب گور مریضوں پر عمل مہمائی کرتے تھے۔ مریض کے جانبر ہونے کا ذرا بھی امکان نظر آئے تو بگڑ جاتے اور اسے دھتکار کر نکلوا دیتے کہ جاؤ، ابھی کچھ دن اور ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ اللہ نے اُن کے ہاتھ میں کچھ ایسا اعجاز دیا تھا کہ ایک دفعہ اُن سے رجوع کرنے کے بعد کوئی بیمار خواہ وہ بستر مرگ پر ہی کیوں نہ ہو، مرض سے نہیں مر سکتا تھا۔ دوا سے مرنے لگا تھا۔ مرض کے جراثیم کے حق میں تو اُن کی دوا گویا آبِ حیات کا حکم رکھتی تھی۔ غریبوں کا علاج مفت کرتے، مگر رُوسا کو فیس لیے بغیر نہیں مارتے تھے۔ حکیم صاحب اُونچا سنتے ہی نہیں، اُونچا سمجھتے بھی تھے۔ یعنی صرف مطلب کی بات۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ ہم اس پر اعتراض کرنے والے کون؟ لیکن مسیبت یہ تھی کہ طبابت میں شاعری اور شاعری میں طبابت کے ہاتھ دکھا جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ دونوں میں وزن کے پابند نہ تھے۔ حکیموں میں اپنے علاوہ، استاد ابرہیم ذوق کے قائل تھے۔ وہ بھی صرف اس بنا پر کہ بقول آزاد، استاد نے موسیقی اور نجوم سیکھنے کی سعی نامشکور کے بعد طب کو



چند روز کیا۔ مگر اس میں خون ناحق نظر آنے لگے۔ چنانچہ انہی صلاحیتوں کا رخ اُردو شاعری کی طرف موڑ دیا۔ حکیم صاحب موصوف اپنی ذات و بیاض پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ ہاں کبھی اپنی ہی ایجاد کردہ معجون فلک سیر کے زیر اثر طبیعت فراخ دلی و فروتنی پر مائل ہو جاتے تو سخن فہم مریض کے سامنے یہاں تک اعتراف کر لیتے کہ ایک لحاظ سے غالب ان سے بہتر تھا۔ خط اپنے خاصے لکھ لیتا تھا۔ مگر اب وہ مکتوب الیہ کہاں جنھیں کوئی ایسے خط لکھے۔

خاندانی حکیم تھے۔ اور خاندان بھی ایسا ویسا! ان کے پروادا قصبہ سندیلہ کے جالینوس تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ حکیم جالینوس نابینا و کثیر الازواج نہ تھا۔ یہ تھے۔ بنیا میں چار دانگ سندیلہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ راویان رنگیں بیاں گزارش کرتے ہیں کہ آبائی حویلی میں چار بیگیاں (جن میں ہر ایک چوتھی تھی) اور درجنوں عریس اور لونڈیاں لی پھرتی تھیں۔ تنہا کے وقت دھڑکرنے کی ہر ایک کی باری غرر تھی، مگر آدھی رات گئے آواز دے کر سب کی نیند خراب نہیں کرتے تھے۔ ہوئے سے نبض چھو کر باری والی کو جگا دیتے تھے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غلط نبض پر ہاتھ ڈالا ہو۔

نبیرہ جالینوس نے ہماری نبض، زبان، جگر، پیٹ، ناسخ، قارورہ، پیوٹے — مختصر یہ کہ سوائے کہنی کے ہر چیز کا مدائنہ فرمایا۔ فیس کا تعین کرنے سے پہلے ہماری کار کا انجن بھی اشارت کروا کے بحشمہ خود ملاحظہ فرمایا اور فیس معاف کر دی۔ پھر بھی احتیاطاً پوچھ لیا کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں آنکھوں کے سامنے ترسے ناچتے ہیں؟ ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا تو مرض اور اردو زبان کے مزے کوٹتے ہوئے فرمایا کہ دست بخیر! مقام ہاؤس پہ جو دروستہ، درو میں جو چپک ہے، چپک میں جو ٹیس ہے، اور ٹیس میں جو کنگ رہ رہ کر محسوس ہوتی ہے، وہ ریاچی ہے! بقول مرزا، یہ شخصیں نہ مکتی، ہمارے مرض کی تو بہن تھی۔ ہمارے



اپنے جراثیم کے منہ پر طمانچہ تھا چٹناٹھی تو بانی طب سے داسہا اعتقاد پر ہیں گھنٹوں کے لیے بالکل اٹھ گیا۔ ان سو سو گھنٹوں میں ہم نے کہنی کا ہر زاویہ سے انکس ریسے کرایا۔ لیکن اس سے مایوسی اور بڑھتی۔ اس لیے کہ کہنی میں کوئی خرابی نہیں نکلی!

پورے دو مہینے مرض میں پند و یوگ آسن اور مچھلی کے ساگ کا اضافہ کرنے کے بعد ہم نے مرزا سے ہا کہ کیفیت بیان کی۔ استمار حال کے بعد ہمارے دائیں چپنی پر دو انگلیاں لکھ کر انھوں نے نبض دیکھی۔ ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو بولے، چالیس سال بعد مرد کا دل نیچے اتر آتا ہے! پھر فرمایا، تمہارا علاج یہ ہے کہ فوراً بانی فوکل بنالو۔ ہم نے کہا، مرزا! تم تر شراب بھی نہیں پیتے۔ کہنی کا آنکھ سے کیا تعلق؟ بولے، چار پانچ مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری پاس کی نظر بھی خراب ہو گئی ہے۔ کتاب نزدیک ہو تو تم پڑھ نہیں سکتے۔ تم آواز سے سن ہی کہنا چاہتے ہو۔ تم اخبار اور کتاب کو آنکھ سے تین فٹ دیر بائیں ہاتھ میں پکڑ کے پڑھتے ہو۔ اسی لیے ہاتھ کے پٹھے اکڑ گئے ہیں۔ چٹناٹھی کہنی میں جو درد ہے، درد میں جو۔۔۔۔۔ الخ۔

مانا کہ مرزا ہمارے مونس و غم غمازی ہیں، لیکن ان کے سامنے افلتتے مرض کرتے ہوتے ہیں ہول آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے فقیری چٹکوں سے اصل مرض کو تو جڑ بنیاد سے اکھڑ کر پھینک دیتے ہیں، لیکن تین چار نئے مرض گلے پڑ جاتے ہیں جن کے لیے پھر انہی سے

★ بانی فوکل: اس عینک کو کہتے ہیں جس میں دو شیشے اوپر نیچے جڑے ہوں۔ اوپر والا شیشہ دور کی چیزیں دیکھنے کے لیے اور نیچا صرف پڑھنے کے لیے۔ ایسی عینک کی ضرورت عام طور پر آدمی عمر ادر، آدمی عمر ادر، یعنی چالیس برس کے بعد پڑتی ہے۔ اللہ کے خاص بندوں پر البتہ یہ عجب وقت پہلے بھی آن پڑتا ہے۔



مُجموع کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ ہر دفعہ اپنے علاج سے ہر مرض کو چار سے ضرب دیتے چلے جاتے ہیں۔ فائدہ اس طریق علاج کا یہ ہے کہ شفا تے جُزوی کے بعد جی بھر علالتِ اصلی کے رات دن ڈھونڈتا ہے۔ اور مریض کو اپنے مفرد مرض کے مرحوم جراثیم بے طرح یاد آتے ہیں اور وہ اُن کی شفقتوں کو یاد کر کر کے روتا ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! تین چار مہینے سے یہیں تکیے پر صبح و رات سفید بال پڑے ملتے ہیں۔ فرمایا، اپنے تکیے پر؟ عرض کیا ہاں! شرکاء ہر مز کے مخصوص جاسوسی انداز میں چند منٹ گہرے غور و خوض کے بعد فرمایا، غالباً تمہارے ہول کے۔ ہم نے کہا، یہیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ بولے، بھائی میرے! تم نے تمام عمر ضبط و احتیاط سے کام لیا ہے۔ اپنے نجی جذبات کو ہمیشہ شرعی حدود میں رکھا ہے۔ اسی لیے تم ۳۸ سال کی عمر میں گئے ہو! اس تشخیص کے بعد انھوں نے ایک روغنی خضاب کا نام بتایا، جس سے بال کلے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چلتے وقت انھوں نے یہیں سختی سے خبردار کیا کہ تیل برش سے لگایا جائے ورنہ پھیلی پر بھی بال نکل آئیں گے، جس کے وہ اور دوا سنا کچھنی ہرگز ہرگز دہمہ دار نہ ہوں گے۔ واپسی میں ہم نے انتہائی بے صبری کے عالم میں سب سے بڑے سائز کی شیشی خریدی اور دکاندار سے ریزگاری بھی واپس نہ لی کہ اس میں سراسر وقت کا زیا تھا۔ چالیس دن کے مسلسل استعمال سے یہ اثر ہوا کہ سر پر جتنے بھی کلے بال تھے، وہ تو ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ البتہ جتنے سفید بال تھے، وہ بالکل مضبوط ہو گئے۔ چنانچہ آج تک ایک سفید بال نہیں گرا، بلکہ جہاں پہلے ایک سفید بال تھا، وہاں اب تین نکل آتے ہیں۔

باقی فوکل کا نام آتے ہی ہم سنبھل کے بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا، مرزا! مگر ہم تو ابھی چالیس سال کے نہیں ہوتے۔ بولے، مرض کے جراثیم پڑے لکھے نہیں ہوتے کہ کیلنڈر دیکھ کر حلقہ کرتا دھماکا تو دیکھو اپنا۔ صحت ایسی کہ ہیمہ کمپنوں کے ایجنٹ نام سے جھگتے ہیں۔ صورت ایسی



جیسے معاف کرنا، ریڈیو فوٹر۔ اور رنگ بھی اب گندمی نہیں رہا۔ خوفِ الہی واپس سے زرد ہو گیا ہے۔ اگر کبھی یاروں کی بات مان لیتے تو زندگی سفور جاتی۔ ہم نے کہا، ہمارا جو حال ہے وہ تنہا ایک آدمی کے غلط فیصلوں سے سرگرم نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو اس میں پوری قوم کا ہاتھ نظر آتا ہے! فرمایا، جاپان میں فین باغبنانی کے ایک مخصوص شعبے ہونسانی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے باہر نشیت و ریشیت و رختوں کو اس چاقو پونچلے سے اگاتے اور سینچتے ہیں اور ان کی اٹھان کو اس طرح قابو میں رکھتے ہیں کہ تین تین سو سال پرانے درخت میں پھل پھول بھی آتے ہیں پت تجڑ بھی ہوتا ہے، مگر ایک بالشت سے اونچا نہیں ہونے پاتا۔ تم نے اپنی شخصیت کو اسی طرح پالا پوسا ہے۔

ہم نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا، مرزا! ہم ایسے نہ ہوتے تو تم کسے نصیحت کرتے؟ کچھ نرم پڑے۔ فرمایا، نصیحت سے غرض اصلاح کس مسخرے کو ہے۔ مگر تم نے داغ سے کبھی کام نہیں لیا۔ خالی چال چلن کے برتنے پر ساری زندگی گزار دی۔ ہم نے کہا، مرزا! تم تو یہ نہ کہو۔ ہم تمام عمر اپنی خواہشات سے گویا جنگ کرتے رہے ہیں۔ تم ہمارے دل کے کھوٹ سے واقف ہو۔ یہ آتش شوق

پوری بھی نہیں، یہ مجھاتی ہوتی سی ہے

جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، خدا شاہد ہے کہ ہمارا کوئی کام، کوئی عمل خلافِ شرع نہیں۔ لیکن اگر حجت و دوزخ کا فیصلہ فقط نیت کی بنا پر ہوتا تو ہمارے دوزخ میں جانے میں خود ہمیں کوئی شبہ نظر نہیں آتا۔ مسکرا دیے۔ فرمایا، جن خواتین نے اپنی خوبصورتی سے تمہارے دھیان گیان میں خلل ڈالا، اُن کی تعداد کچھ نہیں تو، کراچی کی نصف آبادی کے برابر تو ہوگی؟ ہم نے مرزا کو یاد دلایا کہ لڑکپن ہی سے ہم پر اپنی زندگی بسر کرنے کے سخت خلاف



ہستے ہیں۔ مار دھاڑ سے بھر پور جمیں باندھ جیسی زندگی گزارنے کی خاطر کیسے کیسے جتن کیے۔ انہیں تو کیا یاد ہوگا، قاضی عبدالقدوس ان دنوں یہیں BULL FIGHTING کی ٹریننگ دیا کرتے تھے۔ اور ایک دھڑھی دار بوک بکرے کو سُرنج ترکی ٹوپی پہنا کر، یہیں اُس کے خلاف اشتعال دلایا کرتے تھے۔ مٹل میں ۳۳ نمبر سے حساب میں فیل ہونے کے بعد ہم نے ذریعہ معاش کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ والدہ اجازت دے دیں تو PIRATE (بحری قزاق) بن جائیں لیکن جب سن شعور کو پہنچے اور انگریز حکمرانوں سے نفرت کے ساتھ ساتھ نیک بلکی تمیز بھی پیدا ہوئی تو زندگی کے نصب العین میں مرزا ہی کے مشورے سے اتنی اصلاح کرنی پڑی کہ صرف انگریزوں کے جہازوں کو ٹوٹائیں گے۔ مگر اُن کی میموں کے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے۔ نکاح کریں گے۔ فرمایا ”یہ سب علامتیں“ مٹل ایج“ کی ہیں جو تمہارے کیس میں ذرا سویرے ہی آگتی ہے۔ ایک روسی انارکسٹ نے ایک دفعہ کیا اچھی تجویز پیش کی تھی کہ ۲۵ سال سے زائد عمر والوں کو پھانسی دے دی جاتے لیکن پھانسی سے زیادہ عبرت ناک سزائیں جیلوں کے لیے یہ ہوگی کہ یہیں زندہ رہنے دیا جائے۔ ”مٹل ایج“ کا بجز پیری کوئی علاج نہیں۔ ہاں تنگ دستی اور تصوف سے تھوڑا بہت آرام آجاتا ہے۔ ہمارے یہاں سن یاس کے لے دے کے دوہی مشغلے ہیں۔ عیاشی — اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو — تصوف! اور قوالی، ان دونوں کا عطر فتنہ ہے!

”اور تمہارا علاج ہے ایک عدد بانی فوکل اور جمہرات کی جمہرات قوالی! دو دن سے ساتیں گلبر شاہ کا عرس ہو رہا ہے۔ آج رات بھی ہمارے پیر صاحب قبلہ نے محفل سماع کا اہتمام فرمایا ہے۔ ملے دلتے قوالوں کی چوکی کے علاوہ حیدر آباد کی ایک طوائف بھی ہدیہ نیاز پیش کرے گی۔ ہم نے پوچھا ”زندہ طوائف؟“ بولے ”ہاں! سچ مچ کی! مرے کیوں جا رہے ہو؟ شین قاف کے



علاوہ تک سبک سے بھی درست۔ حضرت سے بیعت ہونے کے بعد اُس نے شادی بیاہ کے مجروں سے توبہ کر لی ہے۔ اب صرف مزاروں پر گاتی ہے یا ریڈیو پاکستان سے! اور صاحب! ایسا گاتی ہے ایسا گاتی ہے کہ گھنٹوں دیکھتے رہو! ہنستے کیا ہو۔ ایک نکتہ آج بتائے دیتے ہیں۔  
 گانے والی کی صورت اچھی ہو، تو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

عشاء کے بعد ہم نے قوالی کی تیاریاں شروع کیں۔ عید کا کڑھا ہوا کرنا پہنا۔ جمعہ کی نماز والے خاص جوتے نکالے۔ (مسجد میں ہم کبھی عام جوتے پہن کر نہیں جاتے۔ اس لیے کہ جوتے اگر ثابت ہوں تو مسجد سے میں بھی دل انھیں میں پڑا رہتا ہے) مرزا ہمیں لینے آتے تو نتھنے پھڑکاتے ہوئے دریافت کیا کہ آج تم میں سے جنازے کی سی بویوں آرہی ہے؟ ہم نے گھبرا کر اپنی نبض دیکھی۔ دل تو ابھی دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بات سمجھ میں آئی تو ہم نے اقرار کیا کہ گرم شیر وانی دو سال بعد نکالی ہے۔ کافوری گولیوں کی بوبری طرح بس گتی تھی۔ اُسے دبانے کے لیے تھوڑا سا جنا کا عطر لگا لیا ہے۔ کہنے لگے جہاں آدھ پھسل کا اتنا لحاظ رکھا ہے وہاں اتنا اور کرو کہ ایک ایک روپے کے نوٹ اندر کی جیب میں ڈال لو۔ ہم نے پوچھا کیوں فرمایا، جو شعر تمھاری یا میری سمجھ میں آجائے، اُس پر ایک نوٹ ادب کے ساتھ نذر کرنا چنانچہ تمام رات ہماری یہ دھری ڈیوٹی رہی کہ دام شنیدن بچھاتے بیٹھے رہیں اور اس شغل شبینہ کے دوران مرزا کے چہرے پر بھی مستقل نظر جماتے رہیں کہ جوں ہی اُن کے منتھنوں سے ہویا ہو کہ شعر سمجھ میں آ گیا ہے اپنی ہتھیلی پر نوٹ رکھ کر پیر و مرثد کو نذر گزرائیں اور وہ اُسے چھو کر قوالوں کو بخش دیں۔

★ مزاج داں جانتے ہیں کہ مہمل شعر سمجھ میں آجائے تو مرزا کے نتھنے فرکوش کی طرح

پھڑکنے لگتے ہیں۔



اپنی ذات سے مائوس لوگوں کا اس سے زیادہ نمائندہ اجتماع ہم نے اپنے چار سالہ تجربے میں نہیں دیکھا۔ شہر کے چوٹی کے ادھیڑ یہاں موجود تھے۔ ذرا دیر بعد پیر صاحب شریف لاتے۔ بھاری بدن۔ غیند میں بھری ہوئی آنکھیں۔ چھارج سنی اڑھی۔ کترواں لبیں۔ ٹخنوں تک گیرا کرتا۔ سر پر سیاہ مٹل کی چوڑی شیعہ لپٹی جس کے نیچے روپلی بالوں کی لگڑ۔ ہاتھ میں سبز جریب۔ ساز ملانے گئے یعنی ہارمونیم کو تالیوں سے اور تالیوں کو شکرے سے تھپایا گیا۔ اور جب کلام شاعر کو ان تینوں کے تابع کر لیا گیا تو قوالی کا رنگ جما۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پائے کے مغنیوں کو تو مغلوں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا، تاکہ کوئی بادشاہ انھیں ہاتھی کے پاؤں تلے زندہ وا ڈالتا۔ انھوں نے مولانا جامی کے کلام میں میرا بانی کے دوہوں کو اس طرح شیر و شکر کیا کہ فارسی زبان سرسار مارواری بولی ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہونے لگی اور ہم جیسے بے علمے کو تو اصل پر نقل کا دھوکا ہونے لگا۔

قوالی شروع ہوتی ہے تو ہم پانچویں صف میں دوڑاؤ بیٹھے تھے۔ نہیں، محض دوڑاؤ نہیں۔ اس طرح بیٹھے تھے جیسے التجیات پڑھتے وقت بیٹھتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی محفل رنگ بر آئی، ہم حال کھیلنے والوں کے دھکے کھاتے کھاتے اتنے آگے نکل گئے کہ رات بھر ٹانگیں غلیل کی طرح پھیلاتے ایک ہارمونیم کو گود میں لیے بیٹھے رہے۔ ایک فوارہ رونے ہمیں ایک روپیہ بھی دیا۔ ہمارا حشر یعنی چلتے پانی بھی قوالوں کے ساتھ ہوا۔ دھکوں کے ریلے میں ہم قوالوں کی ٹولی کو چھپرتے ہوئے دوسرے دروازے سے کبھی کے باہر نکل پڑے ہوتے، مگر بڑی خیریت گزری کہ ایک کلارینٹ نے ہمیں بڑی مضبوطی سے روک رکھا۔ یہ کلارینٹ کوئی سوا گز لمبا ہوگا۔ اس کا بے ضرر میرا تو سازندے کے منہ میں تھا، لیکن پچن ہمارے کان میں ایسا فٹ ہو گیا تھا کہ زور کے دھکوں کے باوجود ہم ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔



آخر شب حضرت نے بطور خاص فرمائش کر کے طوائف سے اپنی ایک سحر سے خارج غزل گواہی جسے اس غیرت ناپسند نے سُر مال سے بھی خارج کر کے سہ آتش کر دیا۔ حضرت اپنا کلام سن کر اس قدر آبدیدہ ہوئے کہ چھپا ہوا رومال (جس کے حاشیے پر چند اشعار کھانے کی فضیلت میں رقم تھے) تر ہو گیا۔ قطع جی توڑ کر گایا اور زباں پہ بار خدایا شاعر کا نام آیا تو ناچتے ہوئے جا کر سر سنا کر دیا۔ حضرت نے ازراہ پرورش اصلی چھوہارے کی گٹھلیوں کی ہزار دانہ تسبیح اپنے دستِ غناؤں سے اُس کے گلے میں ڈال دی۔ اور اپنی خاک پا اور حجرہ خاص کی جا رُوب بھی مرحمت فرمائی۔ چار بجے جب سب کی جیبیں خالی ہو گئیں تو بیشتر کو حال آگیا۔ اور ایسی دھمال مچی کہ تکیہ کے گنبد کی ساری چمکا ڈریں اڑ گئیں۔ کسی کے پاؤں کی ضرب پستانہ سے حضرت کے خلیفہ کی گھڑی کا شیشہ چور چور ہو گیا اور اب وہ بھی اپنی دستارِ خلافت، جُبَّہ، بائی فوکل اور چاندی کے ٹن اُتار کر میدان میں کود پڑے۔ صرف انگوٹھی اور موزے نہیں اُتارے۔ سو وہ بھی بجاالتِ مستی کسی نے اُتار لیے۔ نوٹوں کی بوچھا بند ہوئی اور اب ہر بیت پر جزاک اللہ، جزاک اللہ کا غلطہ بلند ہونے لگا۔ اس بھاگ بھری نے جو دیکھا کہ بندوں نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اب معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے تو جھٹ آخری گلواری کلمے میں دبل کے کہوے پر محفل ختم کر دی۔

پانچ بجے صبح ہم کان سہلاتے محفلِ سمعِ خراشی سے لوٹے۔ کچھ مہل کلام کا، کچھ خود رستی شب کا خمار ہم ایسے غافل سوئے کہ صبح دس بجے تک سنا تے رہے۔ اور سگیم ہمارے پلنگ کے گرد منڈلاتے ہوئے بچوں کو سمجھاتی رہیں ”کبختو! آہستہ آہستہ شور مچاؤ۔ آہا سو رہے ہیں۔ رات بھر اس منحوس مرزا کی مصاحبی کی ہے۔ آج دفتر نہیں جائیں گے۔ اری اوبیلیہ کی بچی! گھڑی گھڑی دروازہ مت کھول۔ مکھیوں کے ساتھ ان کے ملاقاتی بھی گھس آئیں گے۔“ شام کو مرزا چلتے پھرتے ادھر آنکلیے اور (وہ روحانی طمانیت اور رونق دیکھ کر



جو ہمارے منہ پر دفتری فراموشی ادا نہ کرنے سے آجانی ہے) کہنے لگے، ”دیکھا! ہم کہتے تھے ایک ہی صحبت میں رنگ نہ گہرا یا۔ رات حضرت نے توجہ فرمائی؟ قلب پر کوئی اثر مرتب ہوا؟ رزوا ہوا؟“ ہم نے کہا، ”دو یا دو یا تو ہم جانتے نہیں۔ البتہ صبح ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ بغداد میں سنگ مرمر کی ایک عالیشان محل بنا رہے جس کے صدر دروازے پر قومی پرچم کی جگہ ایک ”بکینی“ لہرا رہی ہے۔ چھت وینس ڈی بلو کے مجسموں پر ٹھیری ہوئی ہے۔ حمام کی دیواریں شفاف بلور کی ہیں۔ مرکزی قالین کے گرداگرد غیر محفوظ فصل سے محلی گاؤں کیوں کی جگہ تنک لباس کنیزیں آڑی لیٹی ہیں اور شیوٹ اُن کی گداز ٹیک لگائے ایک دوسرے کے گاؤں کیے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ سامنے ایک زن پرفن نقاروں پر اپنی آنکھیں انحر کے پتے سے ڈھانپے برہنہ رقص کر رہی ہے اور پاؤں سے انہی نقاروں پر مال دیتی جاتی ہے دل بھی اسی مال کے مطابق دھڑک رہے ہیں۔ غرض کہ ایک عالم ہے۔ اُمراء کے آؤ بازو کنیزوں اور پیش خدمتوں کے پرے کے پرے منتظر ہیں کہ ابروئے طلب کی جنبش نیم شبی پر اپنی لذتیں اس پر تمام کر دیں۔ یہ وقفہ وقفہ سے شراب، کباب اور اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ اسی قالین کے سیاہ حاشیے پر چالیس غلام ہاتھ باندھے نظریں جھکاتے کھڑے ہیں۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں!“

”اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ بھاری بدن، نیند میں بھری ہوئی آنکھیں، داڑھی اتنی لمبی کہ ٹائی لگائیں تو نظر نہ آتے۔ سبز جریب ٹیکتے آرہے ہیں۔ ہم نے اپنی ہتھیلی پر سو روپے کا نوٹ رکھ کر پیش کیا۔ حضرت نے نوٹ اٹھا کر وہ جگہ چومی جہاں نوٹ رکھا تھا اور بشارت دی کہ بارہ برس بعد تیرے بھی دن پھر جائیں گے۔ تو باؤن سال کی عمر میں ایک بھرے پرے حرم کا مالک.....“



مرزا کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا۔ قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا  
”تم مجسم شاعر کا، مگر جذبات گھوڑے کے رکھتے ہو!“

پھر انھوں نے لعن طعن کے وہ دفتر کھولے کہ عاجز نے کھڑے کھڑے تمام  
میکینوں کو مع لباس مختصر حرم سے نکال باہر کیا۔

تین نووارد گیشائیں بھٹیں کہ جن کے دیرا کی ابھی آدھی مدت بھی ختم نہیں ہوئی تھی  
کیسے کہوں کہ انھیں بھی اس بڑے ٹنگ میں زار و راہ دیے بغیر نکال دیا!

اور ان کے ساتھ ساتھ تصوف کا خیال بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے دل سے نکال دیا۔  
قلب سیاہ پر قوالوں کے تصرفات باطنی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اب باتی فوکل کا حال  
مُنیے۔ عینک ہمارے لیے نئی چیز نہیں۔ اس لیے کہ پانچویں جماعت میں قدم رکھنے سے پہلے ہمارے  
عینک کا نمبر ۷۔ ہو گیا تھا۔ جو قارئین ننگی آنکھ (انگریزی ترکیب ہے مگر خوب ہے) سے دیکھنے  
کے عادی ہیں انھیں شاید اندازہ نہ ہو کہ ۷۔ نمبر عینک کیا معنی رکھتی ہے۔ ان کی خدمت میں  
عرض ہے کہ اندھا بھینسا کھیلے وقت بچے ہماری آنکھوں پر ٹپی نہیں باندھتے تھے۔ ہمارا عقیدہ  
تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ناک صرف اس لیے بنائی ہے کہ عینک ٹک سکے۔ اور جو بچہ عینک  
سے محروم ہیں ان کی ناک محض زکام کے لیے ہے۔۔۔۔۔ دادا جان قبلہ کا عقیدہ تھا کہ عربی  
نہ پڑھنے کے سبب سے ہم نصف نابینا ہو گئے ہیں۔ ورنہ اس معزز خاندان کی تاریخ میں  
ڈیڑھ سو سال سے کسی بزرگ نے عینک نہیں لگائی۔ اللہ اللہ! کیسا ستاسماں اور کیسے  
سادہ دل بزرگ تھے کہ گریز پرانہ می اسکول کی بس کا راستہ کٹنے کو تماش بینی گردانتے تھے! آج  
معزز خاندان: جس کا سلسلہ نسب ڈیڑھ دو لاکھ واسطوں سے حضرت آدم علیہ السلام  
سے جا ملتا ہے۔



ہمیں اس کا ملال نہیں کہ وہ ایسا کیوں سمجھتے تھے، بلکہ اس کا ہے کہ ہم خود ہی کچھ سمجھ کر بایا کرتے تھے! اور جب ہم چوری کی چوٹی سے بائیس کوپ دیکھ کر رات کے دس بجے بچوں کے بل گھر میں داخل ہوتے تو ڈیوڑھی میں ہمیں خاندان کے تمام بزرگ نہ صرف خود کارڈ آف آزدیتے، بلکہ اپنی لکڑی پر بیرونی بوڑھوں کو بھی بلا لیتے تھے کہ مقابلہ ہمارے فسق و فجور سے تھا۔

عینک پر پھبتیاں سننے سننے ہمارا کمسن کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ لہذا دو سال بعد جب دادا جان کا موتیا بند کا آپریشن ہوا تو ہم نے اس خوشی میں بچوں کو لیمن ڈراپ تقسیم کیں۔ دراصل ہم سب بچے انہیں ”پرا بلم“ بزرگ سمجھا کرتے تھے۔ وہم کے مریض تھے۔ آپریشن سے پہلے مصنوعی بتیسی کے ایک اگلے دانت میں درد محسوس کر رہے تھے، جس کا علاج ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے کرانے کے بعد انہوں نے وہ دانت ہی اکھڑا دیا تھا اور اب اس کی کھڈی میں حقے کی نفرتی مہال فٹ کر کے گھنٹوں ہمارے تار یک مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ آپریشن کے بعد وہ آدھ اونچے موٹے شیشے کی عینک لگانے لگے تھے، جس سے اُن کی غصیلی آنکھیں ہم بچوں کو تگنی بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اللہ جانے خود انہیں بھی اس سے کچھ دکھائی دیتا تھا یا نہیں۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ اسی زمانے میں اباجان چوکیداری کے لیے ایک سنہری رنگ کا بوڑھا کٹا لے آئے تھے جسے کم نظر آتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دادا جان کو کٹا اور کٹے کو وہ نظر نہیں آتے تھے۔ ہماری یہ ڈیوٹی لگی ہوئی تھی کہ ہر دو فریقین کو ایک دوسرے کے حلقہ گزند سے دور رکھیں۔ بالخصوص مغرب کے وقت۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ہماری غفلت سے وہ وضو کر کے ہرن کی کھال کے بجائے کٹے پر بیٹھ جاتے اور مٹو غر الذکر، اول الذکر پر



بھونکنے لگتا تو وہ راقم الحروف پر چبختے کہ اندھا ہو گیا ہے کیا؟ عینک لگا کے بھی اتنا بڑا  
گتا نظر نہیں آتا!

دعویٰ تو مرزا اور عینک ساز دونوں نے یہی کیا تھا کہ بالائی غرنے سے دور  
کی اور زیریں غرنے سے پاس کی چیزیں صاف نظر آئیں گی۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے  
تو یہاں تک اُمید بندھائی تھی کہ دور کے شیشے سے اپنی بیوی اور پاس کے شیشے سے  
دوسرے کی بیوی کا چہرہ نہایت بھلا معلوم ہوگا۔

غافل نے ادھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

لیکن قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد کھلا کہ باتی فوکل سے نہ دور کا جلوہ نظر آتا ہے نہ  
پاس کا۔ البتہ صبر آجاتا ہے۔ یہاں تک تو بسا غنیمت ہے کہ ہم بندوق کی لبلبی نچلے شیشے  
اور کھتی اوپر والے شیشے سے ملاحظہ فرمائیں۔ اور اگر تعمیر بندوق کی مال میں جو پنج ڈالے کار تو  
کا معائنہ کر رہا ہے تو پھر بیچ کے نہیں جاسکتا۔ خیر شکار کو جانے دیجیے کہ یوں بھی ہم جیتھیا  
کے خلاف ہو گئے ہیں۔ (زین بدھ ازم اور اہنسا کی تعلیمات سے قلب ایسا رقیق ہوتا ہے  
کہ اب دلی خواہش یہی ہے کہ خوبصورت پرند کو جان سے مارے بغیر اس کا گوشت کھا سکیں)  
لیکن زینہ سے اترتے وقت

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے

اور جہاں پاؤں پڑتا ہے وہاں سیڑھی نہیں ہوتی۔ مرزا سے اس صورتِ خاص کا ذکر کیا تو  
کہنے لگے کہ عینک ہر وقت لگاتے رکھو۔ لیکن جہاں نظر کا کام ہو، وہاں ایک خوبصورت  
سی چھتری ہاتھ میں رکھا کرو۔ لاہور میں عام ملتی ہیں۔ ہم نے کہا، لاہور میں جو خوبصورت  
چھتریاں عام ملتی ہیں، وہ ہمارے شانے تک آتی ہیں۔ ہم انھیں ہاتھ میں نہیں رکھ سکتے۔



بغل میں بیٹا کھی کی طرح دبا تے پھر سکتے ہیں۔ مگر لالہ رُخساران لاہور اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ بولے، تو پھر ایک کُٹا ساتھ رکھا کرو۔ تمھاری طرح وفادار نہ ہو تو مضائقہ نہیں، لیکن نابینا نہ ہو۔

ہم تو اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاہانِ سلف، بالخصوص بعض مُغل فرمانروا، اپنے سرکش صوبیداروں، شورہ پشت شہزادوں اور تخت و تاج کے دعویدار بھائیوں کی جلاد سے آنکھیں نہ کھلوا کر خود کو تاریخِ ہند متولفہ ایشوری پرشاد میں خواہ مخواہ رسوا کر گئے۔ ان سب کو (بشمول ایشوری پرشاد) بانیِ فوکل لگوا دیتے تو اوروں کو کان بوجھاتے اور یہ دُکھیا رہے بھیک مانگنے کے لائق بھی نہ رہتے۔ ہمارا خیال ہے کہ نہ دیکھنے کا اس سے زیادہ سائنٹیفک آلہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ ذرا کھل کر بات کرنے کی اجازت ہو تو ہم یہاں تک کہہ گزریں گے کہ بانیِ فوکل عفتِ نگاہ کا ضامن ہے۔ مثلاً عینک کے بالائی حصے سے متقابل بیٹھے ہوئے بُتِ سیم تن کے سر تاج کی جبرجنگ مونچھ کا ایک ایک بال گنا جاسکتا ہے، لیکن جب ریشم ساری ہمارے ہی رُخ سرک کر پنڈلی سے اوپر یوں چڑھ جاتے کہ

نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

تو صاحب! اس بے حیائی کا مطالعہ کیسویں سے نہ اوپر کے شیشے سے کیا جاسکتا ہے نہ نیچے کے شیشے سے۔ اور یوں گزرتی آدمی ایک گناہ سے بچ جاتا ہے

وہ اک گنہ جو بظاہر گناہ سے کم ہے

اتنا ضرور ہے کہ اسے لگانے کے بعد مزید تین عینکوں کا اِستِمام لازم آتا ہے

ایک دُور کی۔ دُوسری پاس کی اور تیسری بغیر شیشوں والی — دیکھنے کے لیے۔ یہ



آلاتِ تعیش اس لیے بھی ضروری ہیں کہ یوں دکھانے کو ادھیڑ آدمی کے منہ پر آنکھ آنکھ میں پتلی، پتلی میں تل اور تل میں غالباً بنیاتی بھی ہوتی ہے، لیکن تین سے پانچ فٹ دور کی چیز کسی طور باتی فوکل کے فوکس میں نہیں آتی۔ ایک سانحہ ہو تو بیان کریں۔ پرسوں رات دعوتِ ولیمہ میں جس چیز کو ڈونگا سمجھ کر ہم نے جھپا جھپ اس میں سے پلاؤ کی ساری برٹیا گرا لیں، وہ ایک مولوی صاحب کی پیٹ نکلی ہوئی دس وقت زردی کی کشتی پر بری نظر ڈال رہے تھے۔ یا کل رات گھپ اندھیرے سینا مال میں انٹرول (جسے مرزا وقفہ تاک جھانک کہتے ہیں) کے بعد شانے پر ہاتھ رکھے، جس پیٹ تک پہنچنے کی کوشش کی وہ پیٹ ہماری نہیں نکلی۔ اور نہ وہ شانہ ہماری اہلیہ کا!

انسان کی کوئی محرومی خالی از حکمت نہیں۔ جیسے جیسے کچھ درد بقدر ہماری تاب و تحمل کے ہیں عطا ہوتا ہے، قلبِ بصیرتوں سے گداز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان جب چشم و گوش کا محتاج نہ رہے اور اسے شکل سے زندگی گزارنے کا ہنر آجائے تو صحیح معنوں میں نظم و ضبط کا آغاز ہوتا ہے۔ مرزا کے علاوہ بھلا یہ اور کس کا قول ہو سکتا ہے کہ کایا کا سکھ چاہو تو جوانی میں بہرے بن جاؤ اور بڑھاپے میں اندھے۔ ہو میں سیر و تماشا تو خیر پرانی بات ہوتی، ہم تو اب بنیاتی کا بھی ٹپر کا نہیں کرتے۔ ہو ہو، نہ ہو نہ ہو۔ اب تو ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ الماری میں دائیں طرف تیلون، بائیں طرف پرانی قمیضیں جنھیں اب ہم صرف بند گلے کے سوٹر کے نیچے پہن سکتے ہیں۔ دوسرے خانے میں سلیقے سے تہ کیا ہوا بند گلے کا سوٹر جو اب صرف بند گلے کے کوٹ کے نیچے پہنا جاسکتا ہے۔ آنکھ بند کر کے جو چاہو نکال لو۔ غرض کہ ہر چیز کا اپنا مقام بن جاتا ہے۔ جانماز کی جگہ جانماز۔ رقت انگیز ناول کی جگہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی چپک بک۔ محبوبہ



کی جگہ منکوحہ ——— تکبیر کی جگہ گاؤں تکبیر !

ذرا ترتیب بگڑی اور آبروئے شیوۃ اہل نظر گئی۔ لیکن جس گھر میں بفضلِ تعالیٰ بچے  
ہوں وہاں یہ رکھ رکھاؤ ممکن نہیں۔ اور رکھ رکھاؤ تو ہم نے تکلفاً کہہ دیا ورنہ سچ پوچھیے تو  
کچھ بھی ممکن نہیں۔

دل صاحبِ ولاد سے انصاف طلب ہے

ایک دن ہم نے جھنجھلا کر بیگم سے کہا، یہ کیا اندھیر ہے۔ تمہارے لاڈلے ہر چیز جگہ سے  
بے جگہ کر دیتے ہیں۔ کل سے چاقو غائب تھا۔ ابھی عقدہ کھلا کہ اس سے گڑیا کا اپنڈکس  
نکالا گیا تھا! تنک کر بولیں اور کیا کھھاڑی سے گڑیا کا پیٹ چیرا جاتا؟ ہم نے سمجھٹ  
اُن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، ہاں! یہ کیسے ممکن ہے۔ اس لیے کہ کھھاڑی  
کے ڈنڈے سے تو اس گھر میں کپڑے دھوتے جلتے ہیں! تم ہی بتاؤ، صبح تازہ مضمون  
کی ناؤ بنگہ پورا بیڑا ٹب میں صفحہ وار نہیں چل رہا تھا؟ تمہارے گھر میں ہر چیز کا ایک نیا  
طریقہ استعمال، ایک نیا فائدہ دریافت ہوتا ہے — سوائے میرے! تمہارے  
سامنے کی بات ہے۔ کہہ دو، یہ بھی جھوٹ ہے۔ پرسوں دوپہر اخبار پڑھتے پڑھتے  
ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی۔ کھلی تو عینک غائب۔ تم سے پوچھا تو اُلٹی ڈانٹ پڑی ”ابھی سے  
کاسے کو اٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر اور سولو۔ ابھی تو گڈومیاں تمہارا بائی فوکل لگائے اندھا  
بھینٹا کھیل رہے ہیں! بانگل اپنے باپ پر پڑے ہیں۔“ بچے سمجھی کے ہوتے ہیں۔ مگر گھر  
کا گھر وایا کہیں نہیں ہوتا۔ صبح دیکھو تو سگریٹ لائٹر کی نو پر ہینڈ کھیا پکائی جا رہی ہے۔ شام  
کو خود بیگم صاحب کیلے بال بکھیرے پندرہ گز گھیر کی شلوار میں ہماری فیسل سے سٹ سٹ  
کمر بند ڈال رہی ہیں۔



سُرخ چوڑیاں چھنکا کر سُہاگ راگ چھیڑتے ہوتے بولیں، ہائے اللہ! دفتر کا غصہ  
گھر والوں پہ کیوں اُتار رہے ہو؟ کسی نے تمہاری پنسل سے کمر بند ڈالا ہو تو اس کے ہاتھ  
ٹوٹیں۔ میں نے تو تمہارے ”پارکر“ سے ڈالا تھا! چلے جس کی قسم لے لو۔ رہے نیچے،  
تو اُن کے نصیب میں تمہاری استعمالی چیزیں ہی لکھی ہیں۔ پھر بھی آج تک ایسا نہیں ہوا  
کہ اُنھوں نے چیز واپس وہیں نہ رکھی ہو۔ ہم نے کہا، یقین نہ ہو تو خود جا کر اپنی بڑی بڑی  
آنکھوں سے دیکھ لو۔ سیفی ریزر کا بلیڈ غائب ہے۔ بولیں، کم از کم خدا سے تو ڈرو۔ ابھی بھی  
میرے سامنے بلیڈ نے پنسل چھیل کر واپس ریزر میں لگایا ہے۔ وہ بچاری خود احتیاط کرتی ہے  
مرزا نے موضع چاکسو (خورو دکلاں) کے نیم بزرگوں کی انجمن کی داغ بیل ڈالی تو  
مفتوں اس تہذیب میں رہے کہ نام کیا رکھا جائے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے  
(گولڈ میڈلسٹ) نے ”انجمن افسردہ دلائل چاکسو رجب پڑ“ تجویز کیا جو اس بنا پر مسترد کر  
دیا گیا کہ ممبری کا دار و مدار محض افسردہ دلی پر رکھا گیا تو چاکسو کے تمام شاعر مع غیر مطبوعہ  
دیوان گھس آئیں گے۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ اس غول کھولاں کا نام باقی  
فوکل کلب ”نہایت موزوں رہے گا کہ باقی فوکل ایک لحاظ سے تمام ان کے ادھیڑوں کا  
قومی نشان ہے۔“

انسان کی فطرت بھی ایک طرفہ تماشہ ہے۔ بوڑھا ہو یا بچہ، نوجوان ہو یا ادھیڑ  
آدمی ہر منزل پر اپنی عمر کے باب میں جھوٹ ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ لڑکے اپنی عمر دو چار سال  
زیادہ بتا کر رعب جلاتے ہیں۔ یہی لڑکے جب نام خدا جوان ہو جاتے ہیں تو نوجوان کہلاتا  
پسند کرتے ہیں۔ جو ادھیڑ مرد نسبتاً راست گو واقع ہوتے ہیں، وہ اپنی عمر دس برس کم بتاتے  
ہیں۔ عورتیں البتہ ہمیشہ سچ بولتی ہیں — وہ ایک دوسرے کی عمر ہمیشہ صحیح بتاتی



ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خون، مشک، عشق اور نابارز دولت کی طرح عمر بھی چھپاتے نہیں چھپتی۔  
 باقی فوکل، انس، بد نظری، گاف، نئی نسل سے بیزاری، رقیق القلبی اور آسودہ حالی — یہ  
 عمر وسطیٰ کی جانی پہچانی نشانیاں ہیں۔ ان سات صفات میں سے چھ کی بست پر (یعنی،  
 آسودہ حالی کو چھوڑ کر) جو ہماری ذات کے گوزے میں بند ہو گئی بھتیں، ہمیں بلا مقابلہ باقی  
 فوکل کلب کا سرٹیری جنرل منتخب کیا گیا۔

کلب کی رکنیت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ آدمی چالیس سال کا ہو۔ اور اگر خود کو  
 اس سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہو تو کہنا ہی کیا۔ حضرت حفیظ جالندھری کے الفاظ میں یہ وہ  
 عجب مرحلہ عمر ہے کہ آدمی کو

ہر بُری بات، بُری بات نظر آتی ہے!

یہ وہ دورِ عافیت ہے جب آدمی چاہے بھی تو نیکی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ انڈونیشیا  
 کے سابق صدر سوئیکارنو کا قول ہے کہ تیس بہاروں کے بعد رُبر کا درخت اور بنتِ حوا کسی  
 مصرف کے نہیں رہتے، جب کہ مرد کسی عمر میں حسن سے مامون نہیں۔ ایسے مقولے کی تردید  
 یا تائید ہمارے بس کا کام نہیں۔ سوئیکارنو تو بزرگِ مردم دیدہ و زن گزیدہ ہونے کے علاوہ  
 صدارت کے صدمے بھی اٹھاتے ہوئے ہیں۔ ہم تو ان سے بھی محروم ہیں۔ پھر یہ کہ چھوٹے  
 منہ کو بُری بات زیب بھی نہیں دیتی۔ رُبر کے بارے میں ہم ابھی صرف اتنا دریافت کر  
 پاتے ہیں کہ غلطیوں کو مٹانے کے لیے خاصی کار آمد چیز ہے۔ رہی صنفِ نازک، سو اپنے  
 محتاط و محدود مشاہدے کی بناء پر ہم کوئی خوبصورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ شیرنی کو کچھار  
 میں کلیں کرتے دیکھنا اور بات ہے اور سرکس کے پنجرے میں بنیڈ کی دھن پر لوٹیں لگاتے  
 ہوتے دیکھنا اور بات۔



البتہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں بہت سے بہت کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سائیر، سائیں کرتا رنگستان، رات رات جیتی جیتی زمین کو نگلنا چلا جاتا ہے وہ لٹی ووق صحرائے عظیم جو سن رسیدہ سینوں میں دمام پھیلاتا رہتا ہے وہ کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا ہے کہ دل آنکھ سے پہلے بھی بوڑھے ہو جایا کرتے ہیں۔ اس بھوکے صحرا میں گونج کے سوا کوئی صدا، کوئی ندا سنائی نہیں دیتی اور کیٹس\* کے سوا کچھ نہیں گاتا۔

مرزا اس بنجر بے رس، بے رنگ، بے امنگ دھرتی کو  
NO WOMAN'S LAND  
کہتے ہیں۔ جس کی بلی جلی سرحدیں صرف باتی فوکل سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ بڑھتے بڑھتے  
سابوں اور بھینی بھینی یادوں کی سرزمین ہے جس کے باسی پیاس کو ترستے ہیں اور بے پیا  
پیتے ہیں کہ انھیں

اس کا بھی مزایا ہے، اُس کا بھی مزایا

ایک دن ہمیں اُوپر کے شیشے سے صفحہ نمبر اور نچلے سے فٹ نوٹ پڑھتا دیکھ کر  
مرزا اُمٹہ اُوپر نیچے کر کے ہماری نقل اُتارنے لگے۔ حاضرین کو ہمارے حال پر خوب ہنسا  
مُچکے، تو ہم نے جل کر کہا، اچھا، ہم تو محض نیک چلنی کی وجہ سے قبل از وقت اندھے ہو  
گئے، لیکن تم کس خوشی میں یہ بوتل کے پنیڈے جتنی موٹی عینک چڑھاتے پھرتے ہو؟

\* CACTUS (ناگ بھنی) کا پھول جتنا بڑا اور خوش رنگ ہوتا ہے، اُس سے زیادہ مازک  
سال بھر میں ایک بھبھو کا پھول کھلتا ہے جو بس ایک رات اپنی بہار دکھا کر مڑ جاتا ہے۔

دو دو سو سال پرانے ایسے کیٹس بھی دیکھے گئے ہیں، جن میں دس برس بعد کہیں ایک پھول آتا  
ہے کہ سینہ شب دہک اُٹھتا ہے۔ لیکن یہ بھی پچھلے پرتک کھلانے لگتا ہے :

آجاؤ جو تم کو آنا ہوا، ایسے میں ابھی شاداب ہیں مسم



فرمایا، مگر یہ باتی فوکل نہیں ہے۔ ہم نے کہا، تو کیا ہوا؟ جس عینک سے تم منہ اندھیرے تفسیر ماجدی کی ہل ہل کے تلاوت کرتے ہو، اُسی سے رات ڈھلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ستر کشا کیبرے دیکھتے ہو! فرمایا، برخوردار! اسی لیے ہمارا دل آج تک سالم ہے!

اور یہ بڑی بات ہے۔ اس لیے کہ مرزا (جو بیس سال سے خود کو مرحوم کہتے اور لکھتے آتے ہیں) اب تک چھوٹے بڑے ملاکر ۳۷ معاشقے کر چکے ہیں۔ ہر محبوبہ کی یاد کو 'لیبل' لگا کر اس طرح رکھ چھوڑا ہے جیسے فٹ پاتھ پر مجمع لگا کے دوایتیں بیچنے والے زہریلے سانپوں اور بھجڑوں کو اسپرٹ کی بوتلوں میں لیے پھرتے ہیں۔ ان معاشقوں کا انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیے، یعنی ناکامی۔ اور یہ اللہ نے بڑا فضل کیا، کیونکہ خدا نخواستہ وہ کامیاب ہو جاتے تو آج مرزا کے فلیٹ میں ۳۷ نفر دہنیں بیٹھی بلکہ کھڑی ہوتیں۔ لیکن بے درپے ناکامیوں سے مرزا کے پاتے حماقت میں ذرا الغزش نہ آئی۔ دو چار ٹانگیں ٹوٹنے سے کھنکھجور اکھیں لنگڑا ہوتا ہے؟ ۳۲ ویں ناکامی کا البتہ قلب نے بڑا اثر لیا۔ اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ راوی کے ریلوے پل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیں۔ لیکن اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پہلے ہی ٹرین سے نہ کٹ جائیں۔ متواتر تین چار شب دوسرا سینما شو بھی اس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دیکھنے گئے کہ واپسی میں مال پر کوئی انھیں بے دردی سے قتل کر دے۔ لیکن کسی غنڈے نے جاگتی جگمگاتی سڑک پر ان کے فاسد خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔ ستم یہ کہ کسی نے وہ جیب تک نہ کاٹی جس میں وہ حفاظتی پستول چھپا کر لے جاتے تھے۔ سب طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے حضرت داتا گنج بخش کی درگاہ کا رخ کیا کہ اسی کا مینار سب سے بلند اور قریب پڑتا تھا۔ مگر وہاں دیکھا کہ عرس ہو رہا ہے۔ آدمیوں پر آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ موسم بھی کچھ نامناسب سا ہے۔



چنانچہ فی الحال ارادہ عظمیٰ کر دیا اور بانو بازار سے چاٹ کھا کر واپس آگئے۔  
 ذرا اتفاق تو دیکھیے کہ دوران بعد یہ بیٹا ہی گر گیا۔ مرزا نے اخبار میں خبر دیکھی تو  
 سرکپڑ کے بیٹھے گئے۔ بڑی حسرت سے کہنے لگے، صاحب! عجیب اتفاق ہے کہ میں اس  
 وقت بیٹا پر نہیں تھا۔ برسوں اس کا قلق رہا۔

اپنی اپنی فکر اور اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔ ایک ہم ہیں کہ جو راتیں گناہوں  
 سے توبہ و استغفار میں گزرنی چاہیں، وہ اب اُٹھی اُن کی حسرت میں ترستے پھڑکتے بیت  
 رہی ہیں۔ نین کنول کھلے بھی تو پچھلے پہر کی چاندنی میں۔ اور ایک مرزا ہیں کہ نظر ہمیشہ نیچی  
 رکھتے ہیں، لیکن سیناں شہر میں سے آج بھی کوئی سلوک کرے تو اس سے انکار نہیں۔  
 انہی کا قول ہے کہ آدمی بوالہوسی میں کمزوری یا کاہلی دکھائے تو بڑی عاشقی رہ جاتی ہے  
 ہم نے دیکھا کہ حالات کیسے ہی نامساعد ہوں، بلکہ اگر بالکل نہوت ہے، لیکن طبیعت  
 حاضر ہے تو مرزا سنگلاخ چٹانوں سے جھٹے شیر ہی نہیں، خود شیریں کو برآمد کرنے کا  
 سلیقہ رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک آدھ دفعہ تو یہ چوٹ بھی ہوتی کہ کوہ کنڈن کو بہن برآوردن!  
 ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے۔ ہمارے اصرار پر ایک بے بی شو (شیر خوار بچوں کی نمائش) میں  
 جج بننا منظور کیا اور وہاں ایک والدہ پر عاشق ہو گئے۔ پہلا انعام اسی کو دیا۔

۴ اگست ۶۶۔ دوپہر کا وقت۔ دن پہلے پیار کی مانند گرم۔ بدن کو ری صُحرآ  
 کی طرح بس رہا تھا۔ ہم گرد اڑاتے، خاک پھانکتے مرزا کو اکتالیسویں سالگرہ کی مبارکباد  
 دینے گلبرگ پہنچے۔ مرزا کراچی سے نئے نئے لاہور آتے تھے اور مقامی کلراہیکیم سے  
 اس درجہ اختلاف تھا کہ سفیدے کے تنوں کو نیلا پیٹ کر دیا تھا۔ ان کے بیرے نے  
 برآمدے سے ہی ہانک لگائی کہ صاحب جی! وہ جو موٹر سائیکل رشکاکے آگے ایک چیز



لگی ہوتی ہے، صر بچہ اُس پہ بیٹھ کے ایک صاحب ملنے آتے ہیں! لیکن مرزا نے نہ یہ اعلان سنا اور نہ ہماری موٹر سائیکل کی بھٹ بھٹ، اس لیے کہ اس وقت وہ سالگرہ کے مہینے انج کے بعد آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے کیس نمبر ۲۹، کو آغوشِ توجہ میں لیے بیٹھے تھے۔ ہم نے شانہ جھنجھوڑ کر مداخلت بجا کرتے ہوئے کہا، مرزا! عجیب بات ہے۔ ہر سالگرہ ہماری عینک کے نمبر اور بے دلی میں اضافہ کر جاتی ہے اور ہمیں ہر شے میں ایک تازہ دراز پڑی نظر آتی ہے۔ مگر تم ہو کہ آج بھی ستاروں پہ کند ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ بولے، شکریہ! نطشے کا فیضان ہے۔ ہم نے کہا، مگر ہمارا مطلب فلمی ستاروں سے تھا! فوراً شکریہ واپس لیتے ہوئے فرمایا " ... ET TU, BRUTUS ? "

دو چار برس کی بات نہیں، ہم نے مرزا کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب

گھٹ گھوڑ گھٹا تلی کھڑی تھی

پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

ابھی وہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ اپنے ٹوئیاں طوطے کی کفالت کر سکیں، لیکن دلِ ناصبور کا یہ رنگ تھا کہ الجبرا کے گھنٹے میں بڑی محویت سے اپنے ہاتھ کی رکھیاؤں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ عمر کی لکیر اُن کی ذاتی ضرورت سے کچھ لمبی ہی تھی۔ مگر شادی کی فقط ایک ہی لائن تھی، جسے رگڑ رگڑ کے دیکھتے تھے کہ شاید پھلے چوبیس گھنٹوں میں کوئی شاخ پھوٹی ہو۔ مدتِ عمر متعدد خاندانی بزرگ اُن کی جوانی پر سایہ فگن رہے۔ بارے اُن کے گھنے گھنے سائے سر سے اُٹھے تو پتہ چلا کہ دنیا اتنی بُری جگہ نہیں۔ لیکن ایک مدت تک مالی حالات نے رخصتِ آوارگی نہ دی اور جی مار مار کے رہ گئے۔ ورنہ ان کا بس چلتا تو بچی کھچی متاعِ عمر کو اس طرح ٹھکانے لگا دیتے، جیسے دلی کے بادشاہ لدے پھندے باغِ لونڈیوں سے



لٹو ادیا کرتے تھے۔ مرزا ۱۹۴۸ تک مرزا یا نہ بسر کرتے رہے۔ یعنی مزاج رتیا نہ اور آمدنی فقیرانہ رکھتے تھے۔ شادی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ خدا بھلا کرے پروفیسر قاضی عبدالقدوس کا جنھوں نے ایک دن اپنی ہتھیلی پر تسلیم سے ضرب تقسیم کر کے مرزا کو اعداد و شمار سے قائل کر دیا کہ جتنی رقم وہ سگرٹوں پر بھونک چکے ہیں، اس سے سگھر شوہر چار دفعہ مہر بیاہ کر سکتا تھا۔ آخر ہم سب نے لگ لپٹ کر ان کی شادی کروادی۔ دو چار دن تو مہر معجل کی دہشت سے سہمے سہمے پھرے اور جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا، لیکن ہنی مون کا ہفتہ ختم ہونے سے پہلے اس حد تک نارمل ہو گئے کہ بے تکلف دوستوں کو چھوڑیے، خود نئی نویلی دلہن کی زبان پر بھی یوں ہی کوئی زمانہ نام آگیا تو مرزا ٹرپ کر مجسم سوال نامہ بن گئے:

کہاں ہے؟ کس طرح کی ہے؟ کدھر ہے؟

انہی کے ایک برادر نسبتی سے روایت ہے کہ عین اُرسی مصحف کے وقت بھی آئینے میں اپنی دلہن کا منہ دیکھنے کے بجائے مرزا کی نگاہیں اُس کی ایک سہیلی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دُنیا گواہ ہے (دُنیا سے یہاں ہماری مراد دُوسری ہے جو مرزا کی یعنی عالم نسواں) کہ مرزا نے جس پہ ڈالی، بُری نظر ڈالی، سوائے اپنی بیوی کے۔ موصوف کا اپنا بیان ہے کہ بندہ شیرخوارگی کے عالم میں بھی بیس سال سے زیادہ عمر کی آیا کی گود میں نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی ندیدی آنکھوں سے خود پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ زکام کے سہ ماہی حملے کے دوران ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کئی بار وصیت کر چکے ہیں کہ میں مرنے لگوں تو اللہ ایک گھنٹہ پہلے میری عینک اُتار دینا، ورنہ میرا دم نہیں نکلے گا۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا کہ مرزا ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تمہارے دشمنوں کے مرنے میں اب ایک گھنٹہ روکیا ہے؟ بولنے



جب میں نرس سے ڈیوٹی کے بعد کا فون نمبر پوچھنے کے بجائے اپنا میٹر پھر پوچھنے لگوں، تو سمجھ لینا کہ تمہارے یار جانی کا وقت آن لگا ہے!

مگر مرزا کی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان کے سینے میں جو بانکا سجیلا ڈان۔ان۔ان دھومیں مچایا کرتا تھا، وہ اب پچھلے پہر دہرا ہوا ہو کر کھانسنے لگا ہے۔ اب وہ آتش دان کے سامنے کبل کا گھونگٹ رکھنے کیلکپاتی آواز میں اپنے نیاز مندوں کو اس عہد پر کی داستانیں سناتے ہیں جب وہ علی الصبح FRIDGE کے پانی سے نہایا کرتے تھے۔ وہ تو یہاں تک شیخی مارتے ہیں کہ آج کل کے مقابلے میں اُس زمانے کی طوائفیں کہیں زیادہ بدچلن ہو کر رہی تھیں۔

مرزا کا ذکر اور پھر بیاں اپنا! سمجھ میں نہیں آتا کس دل سے ختم کریں۔ لیکن کلب کے سرپرست اعلیٰ فہیم اللہ خاں کا تعارف رہا جاتا ہے۔ یہ انہی کے دم قدم بلکہ دام و درم کا ظور ہے جس نے چاکسو خورد و کلاں کے تمام ادھیڑوں کو بغیر کسی مقصد کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ خاں صاحب ہر نسل کی امریکی کار اور گھوڑوں کے دلدادہ ہیں۔ آخر الذکر کی رفتار و کردار سے اتنے متاثر ہیں کہ کسی حسین خاتون کی انتہائی تعریف کرنی مقصود ہو تو اسے گھوڑی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اوروں پر بہت ہوتا تو رزق کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ ان پر پوری بارہ دری کھلی ہوئی ہے۔ اور وہ بھی روزِ اوّل سے ورنہ ہونے کو تو فارغ البالی نہیں بھی نصیب ہوئی، مگر بقول شاعر

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

ہم جب چو بختی جماعت میں پہنچے تو اُن کے بڑے صاحبزادے میٹرک میں دوسری دفعہ فیل ہو چکے تھے۔ لیکن پیری کا احساس تو گجا، جب سے ہم نے بائی فوکل



لگایا ہے، ہمیں اپنی تازہ ترین یعنی ماہ رواں کی منظورِ نظر سے ”اسکل“ کھلوا کر حسینوں کی نگاہ میں ہمارے عزت اور عمر بڑھاتے ہیں۔ جس مقام پر ہم اب لا حول پڑھنے لگ گئے ہیں وہاں ان کی زبان ابھی تک سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے سونگھی جاتی ہے۔ ہم نے ان کی جوانی کی گرمیاں نہیں دیکھیں۔ ہاں، بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ جب موصوف کی جوانی محلے کی دوشیزاؤں کے والدین پر گراں گزرنے لگی تو انھوں نے ہمسایوں کے در و دیوار پہ حسرت سے نظر کر کے چاکسو خورد کو خیر باد کہا اور بیٹی کا رخ کیا، جہاں اُون کی آڑھت کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۷ء تک کئی اُونچے گھرانوں کی روشن خیالی پر متصرف رہے۔ مرزا کا کہنا ہے کہ ان کا دل شروع ہی سے بہت بڑا تھا۔ ان کا مطلب ہے کہ اس میں بیک وقت کئی مستورات کی سمائی ہو سکتی تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو انھیں کئی بار قاضی کے سامنے بھی لے گئی۔ اور ہر کالج پہ پھر پھر کے جوانی آتی کہ یہ

عصل ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

اُن کے قہقہے میں جو گونج اور گمک ہے، وہ سندھ کلب کے انگریزوں کی صحبت اور وہیں کی دہسکی سے کشید ہوئی ہے۔ خوش باش، خوش لباس، شاہ خرچ۔ ناجائز آمدنی کو انھوں نے ہمیشہ ناجائز مد میں خرچ کیا۔ طبیعت دھوپ گھڑی کی مانند جو صرف روشن ساعتوں کا شمار رکھتی ہے۔ قوی ہیکل، چوڑی چھاتی، کھڑی کمر، کندھے جیسے خربوزے کی پچانک، گھلتی برستی جوانی۔ اور آنکھیں؟ ادھر دو تین سال سے عینک لگانے لگے ہیں، مگر دھوپ کی فوہ بھی اُس وقت جب سینڈز پٹ کے لباس دشمن ساحل پر غسل آفتابی کے نظارے سے ان کی گدلی گدلی آنکھوں میں ایک ہزار ”اسکندل پاور“



کی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ گھنٹوں کسی کو نظروں سے غُسل دیتے رہتے ہیں۔ پاس کی نظر ایسی کہ اب تک اپنی جوان جہان پوتیوں کے نام کے خط کھول کر بغیر عینک کے پڑھ لیتے ہیں۔ رہی دُور کی نظر، سو جتنی دُور مارل آدمی کی نظر جاسکتی ہے، اتنی دُور بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۶۵ — ۱۹۶۸ ع



## چند تصویریں

سیکھے ہیں مرخوں کے لیے.....

رئیس المتغزلین مولینا حسرت موہانی نے اپنی شاعری کے تین رنگ بتائے ہیں۔  
 فاسقانہ، عاشقانہ اور عارفانہ۔ مولینا کی طرح چکی کی مشقت تو بڑی بات ہے، مرزا عبد الرؤف دیک  
 نے تو مشق سخن سے بھی ذہن کو گراں بار نہیں کیا۔ تاہم وہ بھی اپنے فن (فوٹو گرافی) کو انہی تین  
 مہلک ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے یہاں یہ ترتیب بالکل الٹ ہے۔  
 رہا ہمارا معاملہ، تو ابھی ہم روسو کی طرح اتنے بڑے آدمی نہیں ہوئے کہ اپنے اوپر علانیہ فسق  
 و فجور کی تہمت لگانے کے بعد بھی اپنے اور پولیس کے درمیان ایک باعزت فاصلہ قائم رکھ سکیں  
 لیکن یہ واقعہ ہے کہ مرزا کی طرح ہم بھی ہلاک فن ہیں اور ہمارا نام ابھی اس فن سے اتنا ہی پُرانا ہے  
 کیونکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے، تختی پر قلم گوید کہ من شاہ جہانم، لکھ لکھ کر خود کو گمراہ کرنے سے پہلے  
 ہم کوڑک براؤنی کیمیرے کاٹن دباناسیکھ چکے تھے۔ لیکن جس دن سے مرزا کی ایک نئی گتائی تصویر  
 (جیسے وہ فیکراسٹڈی کہتے ہیں) کو لندن کے ایک رسالے نے زیور طباعت سے آگے کیا  
 ہماری بے ہنرمی کے نئے نئے پہلو اُن پر منکشف ہوتے رہتے ہیں۔

مرزا جب سے بولنا سیکھے ہیں، اپنی زبان کو ہماری ذات پر درزش کراتے رہتے ہیں  
 اور اکثر طرح و انتعار سے منمونی گالی گلوچ میں ادنی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ ابھی تک با



ہے۔ کہنے لگے، یار! برا نہ ماننا۔ تمہارے فن میں کوئی کر وٹ، کوئی پیچ، میرا مطلب ہے کوئی موڑ نظر نہیں آتا۔ ہم نے کہا، پلاٹ تو اُردو ناولوں میں ہوا کرتا ہے۔ زندگی میں کہاں بولے ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری عکاسی بھی تمہاری زندگی ہی کا عکس ہے۔ یعنی اول تا آخر نہ خواری کا ایک ناقابل تقلید اسلوب!

ہر چند کہ یہ کیا بل نے نوازی بہارے کچھ کام نہ آیا۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ مرزا جیسے فرزانے کا ان پڑتے ہیں اور ہماری حقیر زندگی کو اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اسے سائنس رکھ کر اپنی اولاد کو عبرت دلاتے ہیں، تنبیہ و فہمائش کرتے ہیں۔ ان صفحات میں ہم اپنے اسلوب حیات کی توجیہ و تشریح کر کے پڑھنے والوں کے ہاتھ میں کلیدِ ناکامی نہیں دینا چاہتے۔ البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ مرزا کی طرح ہم اپنی نالافتی کو ارتقائی ادوار میں تقسیم تو نہیں کر سکتے، لیکن جو حضرات ہمارے شوقِ منفعل کی داستان ٹھٹھنے کی تاب رکھتے ہیں، وہ دیکھیں گے کہ ہم سدا سے حاجیوں کے پاسپورٹ فوٹو اور تاریخی کھنڈروں کی تصویریں ہی نہیں کھینچتے رہے ہیں۔

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

لیکن ہم کس شمار قطار میں ہیں۔ مرزا اپنے آگے بڑے بڑے فوٹو گرافروں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ایک دن ہم نے پوچھا، مرزا! دنیا میں سب سے بڑا فوٹو گرافر کون ہے؟ یوسف کارش یا سیل بیٹن؟ مسکراتے ہوئے بولے، تم نے وہ حکایت نہیں سنی؟ کسی نادان نے مجھ سے پوچھا، خلافت پر حق حضرت حسینؑ کا ہے یا یزید لعینؑ کا؟ بولا، اگر سچ پوچھو تو یہی کس ہے!

ادھر چند سال سے ہم نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہفتہ بھر کی اعصابی شکست و ریخت



کے بعد اتوار کو مکمل "سبت" مناتے ہیں۔ اس سبت کی طرف منہ کرنا ہے سو وادی تھوس صبح تک ہر وہ فعل اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں جس میں کام کا ادنیٰ شائبہ، امکانی کا ذرا بھی اندیشہ ہو۔ چھ دن دنیا کے ایک دن اپنا۔ (مرزا تو اتوار کے دن اتنا آزاد اور کھلا کھلا محسوس کرتے ہیں کہ فجر کی نماز کے بعد دُعا نہیں مانگتے۔ اور پیر کے تصور سے اُن کا جی اتنا ابھرتا ہے کہ ایک دن کہنے لگے، اتوار اگر پیر کے دن ہوا کرتا تو کیا ہی اچھا ہوتا!) یہ بات نہیں کہ ہم محنت سے جی چراتے ہیں۔ جس شغل (فوٹو گرافی) میں اتوار گزرتا ہے، اُس میں محنت تو اتنی ہی پڑتی ہے جتنی دفتری کام میں۔ لیکن فوٹو گرافی میں دماغ بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور "ماڈل" اگر نچلے نہ بیٹھنے والے بچے ہوں تو نہ صرف زیادہ بلکہ بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے مرزا نے اب ہمیں چند استادانہ گریکھا دیے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ پرندوں اور بچوں کی تصویریں بچتے وقت صرف آنکھ پر فوکس کرنا چاہیے کہ ان کی ساری شخصیت کھینچ کر آنکھ کی چمک میں آجاتی ہے۔ اور جس دن اُن کی آنکھ میں یہ چمک نہ رہی، دُنیا اندھیر ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ جس بچے پر تمہیں پیار نہ آتے، اس کی تصویر ہرگز نہ کھینچو۔ فرانس میں ایک نفاست پرندہ مصور گزرا ہے جو نجیب الطرفین گھوڑوں کی تصویریں پینٹ کرنے میں یدِ طولی رکھتا تھا۔ نشاط فن کے اس درجہ عزیز تھا کہ جو گھوڑا دو غلا یا بیس ہزار فرینک سے کم قیمت کا ہو، اُس کی تصویر ہرگز نہیں بناتا تھا، خواہ اس کا مالک بیس ہزار مخفانہ ہی کیوں نہ پیش کرے۔

مہینہ یاد نہیں رہا۔ غالباً دسمبر تھا۔ دن البتہ یاد ہے، اس لیے کہ اتوار تھا۔ اور مذکورہ بالا باتیں اصولوں سے لیں، ہم اپنے اوپر ہفتہ وار خود فراموشی طاری کیے ہوتے۔ گھر میں ہمارے عزیز ہمسائیہ کی بچی ناجیہ، اپنی سیفو (سیامی بلی) کی قد آدم تصویر کھینچوانے آتی ہوتی تھی۔ قد آدم سے مراد شیر کے برابر تھی۔ کہنے لگی، "اسکل! جلدی سے ہماری بلی کا فوٹو کھینچ دیجئے"



ہم اپنی گڑیا کو اکیلا چھوڑ آتے ہیں۔ کل صبح سے بچاری کے پیٹ میں درد ہے۔ جی بھی تو کل ہم اسکول نہیں گئے۔ ہم نے جھٹ پٹ کیمبرے میں تیز رفتار فلم ڈالی۔ مینوں "فلڈ لیمپ" ٹھکانے سے اپنی اپنی جگہ رکھتے۔ پھر تلی کو دبوچ دبوچ کے میز پر بٹھایا۔ اور اس کے منہ پر مسکراہٹ لالے کے لیے ناجیہ پلاسٹک کا چوہا ماتھ میں مپرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہم ٹہن دبا کر ایسا سیکنڈ میں اس مسکراہٹ کو بھاتے دوام بخشنے والے تھے کہ پچاسک کی گھنٹی اس زور سے بجی کہ سیفورا اچھلی کر کیمبرے پر گری اور کیمبرہ قالین پر۔ ہر دو کو اسی حالت میں چھوڑ کر ہم ناوقت آنے والوں کے استقبال کو دوڑے۔

## حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

پچاسک پر شیخ محمد شمس الحق کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کے پہلو سے روتی کے دگلے میں مٹھن و مستور ایک اور بزرگ سچوید اٹھتے، جن پر نظر پڑتے ہی ناجیہ تالی بجا کے کہنے لگی:

"ہائے! کیسا کیوٹ سیٹا کلار ہے!"

شیخ محمد شمس الحق کے ماتھوں جان قبلہ نکلے، جو حج کو تشریف لے جا رہے تھے اور ہمیں ثواب عاریں میں شریک کرنے کے لیے موقع چاکسو (خورد) سے اپنا پاسپورٹ فوٹو کھینچوانے آئے تھے۔

"ماتھوں جان تو بضد تھے کہ فوٹو گرافر کے پاس لے چلو۔ بلا سے پیسے لگ جائیں، تصویر تو ڈھنگ کی آئے گی۔ بڑی شکلوں سے رضا مند ہوتے ہیں یہاں آنے پر" انھوں نے شاہین زبلی اجمال بیان کی۔



ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شیخ محمد شمس الحق صاحب کے ماموں جان قبیلہ دیواروں پر قطار اندر قطار آویزاں تصویریں ہاں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگے۔ ہر تصویر کو دیکھنے کے بعد مڑ کر ایک دفعہ ہماری صورت ضرور دیکھتے۔ پھر دوسری تصویر کی باری آتی۔ اور ایک دفعہ پھر ہم پر وہ نگاہ ڈالتے، جو کسی طرح غلط انداز نہ تھی۔ جیسی نظروں سے وہ یہ تصویر دیکھ رہے تھے، اُن سے ظاہر ہوتا تھا کہ صاحبِ نظر کا تعلق اُس نسل سے ہے جس نے کلدار روپے پر بنی ہوئی ملکہ و کٹوریہ کے بعد کسی عورت کی تصویر نہیں دیکھی۔ ایک بانسی سی تصویر کو ذرا قریب جا کر دیکھا۔ لا حول پڑھی۔ اور پوچھا، یہ آپ کے لڑکے نے کھینچی ہے؟ عرض کیا، جی نہیں! وہ تو تین سال سے ساتویں میں پڑھ رہا ہے۔ بولے، ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔

شیخ محمد شمس الحق صاحب کے ماموں جان قبیلہ (اپنی اور کاتب کی سہولت کے مد نظر آئندہ انہیں فقط ماموں لکھا جائے گا۔ جن قارئین کو ہمارا اختصار ناگوار گزرے، وہ ہر دفعہ ماموں کے بجائے شیخ محمد شمس الحق صاحب کے ماموں جان قبیلہ پڑھیں) ہماری رہبری کے لیے اپنے تایا ابا مرحوم کی ایک مٹی مٹائی تصویر ساتھ لاتے تھے۔ شیشم کے فریم کو جنائی انگوچھے سے جھاڑتے ہوتے بولے ”ایسی کھینچ دیجیے“ ہم نے تصویر کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ماموں کے عم بزرگوار بھی وہی روتی کا دکلا پہنے کھڑے ہیں، جس پر الٹی کیریاں بنی ہوئی ہیں۔ تلوار کو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ جھاڑو کی طرح۔ عرض کیا، قبیلہ! پاسپورٹ فوٹو میں تلوار کی اجازت نہیں۔ فرمایا، آپ کو ہمارے ہاتھ میں تلوار نظر آرہی ہے؟ ہم بہت خفیف ہوتے۔ اس لیے کہ ماموں کے ہاتھ میں واقعی کچھ نہ تھا۔ بجز ایک بے ضرر گلاب کے جسے سونگھتے ہوتے وہ پاسپورٹ فوٹو کھینچنا چاہتے تھے۔



ماموں کے کان 'ط' کی مانند تھے۔۔۔ باہر کو نکلے ہوئے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جاتے کہ ہم جسمانی عیوب کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ درحقیقت اس تشبیہ سے ہمیں کانوں کی افادیت دکھانی مقصود ہے۔ کیونکہ خدا نخواستہ کانوں کی ساخت ایسی نہ ہوتی تو ان کی ترکی ٹوپی سارے چہرے کو ڈھانک لیتی۔ ابتدائی تیاریوں کے بعد بڑی فٹوں سے انھیں فوٹو کے لیے کرسی پر بٹھایا۔ کسی طرح نہیں بیٹھتے تھے۔ کہتے تھے ”بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کھڑے رہیں اور میں بیٹھ جاؤں۔“ خدا خدا کر کے وہ بیٹھے تو ہم نے دیکھا کہ ان کی گردن ہنتی ہے۔ ظاہر ہے ہمیں فطری رعشے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اصل مصیبت یہ تھی کہ گردن اگر دو سینکڑہ بھتی تو ٹوپی کا چھندنا دو منٹ تک ہٹا رہتا۔ ہر دو عمل کے ایک نایاب وقفے میں ہم نے ”ریڈی“ کہا تو گویا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ایک دم اکڑ گئے اور ایسے اکڑے کہ جسم پر کہیں بھی ہتھوڑی مار کر دیکھیں تو ٹن ٹن آواز نکلے۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد تیسری دفعہ ریڈی کہہ کر کمیرے کے دیدبان (VIEW-FINDER) سے دیکھا تو چہرے سے خوف آنے لگا۔ گردن پر ایک رستی جیسی رگ نہ جانے کہاں سے ابھر آئی تھی۔ چہرہ لال۔ آنکھیں اُس سے زیادہ لال۔ یکلخت ایک عجیب آواز آئی۔ اگر ہم اُن کے منہ کی طرف نہ دیکھ رہے ہوتے تو یقیناً یہی سمجھتے کہ کسی نے سائیکل کی ہوائ نکال دی ہے۔

”اب تو سانس لے لوں؟“ سارے کمرے کی ہوا اپنی ناک سے پپ کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ تصویر کیسی اور کس پوز میں کھینچی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ان کا عمل تنفس کیوں کر برقرار رکھا جائے کہ تصویر بھی کھینچی جائے اور ہم قتلِ عمد کے مرتکب بھی نہ ہوں۔ اپنی نگرانی میں انھیں دو چار ہی سانس رواتے تھے کہ مسجد سے متوفان کی صدا بلند ہوئی۔ اور پہلی ”اللہ اکبر“ کے بعد، مگر دوسری سے پہلے، ماموں کرسی سے اٹھ کر



کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیشے سے جاگتے دھوکا کیا۔ پوچھا، "قید کس طرف ہے؟" ہمارے منہ سے نکل گیا کہ مغرب کی طرف۔ فرمایا، "ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔ اس کے بعد جاننا مطلب کی۔"

ماؤں نے پلنگہ پوش پر ظہر کی نماز قائم کی۔ آخر میں گواہ بند دعا مانگی، جسے وہ لوگ سن کر ایمان لائے۔ سے ضعیف ہو کر ناشوں کی فہرست کہہ سکتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ہمیں مخاطب کر کے بڑی نرمی سے بولے، "چار فرضوں کے بعد دو سنتیں پڑھی جاتی ہیں۔ تین سنتیں کسی نماز میں نہیں پڑھی جاتیں۔ کم از کم مسلمانوں میں!"

دوسرے کمرے میں طعام و قیلولہ کے بعد چاندی کی خلال سے حسب عادت قدیم اپنے مصنوعی دانتوں کی ریخیں گریختے ہوئے بولے، "بیٹا! تمہاری بیوی بہت سگھڑ ہے۔ گھر بہت ہی صاف ستھرا رکھتی ہے۔ بالکل ہسپتال لگتا ہے۔" اس کے بعد ان کی اور ہماری مشترکہ جانکبی پھر شروع ہوئی۔ ہم نے کہا، "اب تھوڑا ریلکس (RELAX) کیجیے۔" بولے، "کہاں کروں؟" کہا، "میرا مطلب ہے بدن ذرا ڈھیلا چھوڑ دیجیے۔ اور یہ بھول جاتیے کہ آپ کیمرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔" بولے، "اچھا! یہ بات ہے!" فوراً بندھی ہوئی ٹمٹھیاں کھول دیں۔ آنکھیں جھپکائیں اور پھیپھڑوں کو اپنا قدرتی فعل پھر شروع کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے اس نیچرل پوز سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے دوڑ دوڑ کر ہر چیز کو آخری ٹچ دیا، جس میں یہ بندھا لگا فقرہ بھی شامل تھا، "ادھر دیکھیے۔ میری طرف۔ ذرا مسکرائیے!" بٹن باکر ہم "شکریہ" کہنے والے تھے کہ یہ دیکھ کر ایرانی قابین پیروں تلے سے نکل گیا کہ وہ ہمارے کہنے سے پہلے ہی خدا جانے کب سے ریلکس کرنے کی غرض سے اپنی بیسی ہاتھ میں لیے ہنسے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا، "صاحب! اب نہ ہنسیے! بولے، "تو پھر آپ سلمے سے ہٹ جاتیے!"



بہیں اُن کے سامنے سے ہٹنے میں زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا پڑا۔ اسی لیے کہ اسی وقت ننھی ناجیہ دوڑی دوڑی آئی اور ہماری آستین کا کونا کھینچتے ہوئے کہنے لگی ”اگلے ابھی اپ! پلیز! جاننا زہ پڑی پنچوں سے وضو کر رہی ہے! ہاتے اللہ! بڑی کیوٹ لگ رہی ہے!“ پھر ہم اس منظر کی تصویر کھینچنے اور ماموں لاجول پڑھنے لگے۔

اگلے اتوار کو ہم پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے فوٹو کی ”ری ٹچنگ“ میں جُٹے ہوئے تھے۔ تیلون کی بند رھویں سلوٹ پر کلف استری کر کے ہم اب ہونٹ کا مٹا چھپانے کے لیے صفر نمبر کے برش سے مونچھ بنانے والے تھے کہ اتنے میں ماموں اپنی تصویریں لینے آدھکے۔ تصویریں کیسی آئیں، اس کے متعلق ہم اپنے منہ سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ مکالمہ خود چٹاخ پٹاخ بول اُٹھے گا :

”ہم ایسے ہیں؟“

”کیا عرض کروں!“

”تمہیں کس نے سکھایا تصویر کھینچنا؟“

”جی! خود ہی کھینچنے لگ گیا۔“

”ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔“

”آخر تصویر میں کیا خرابی ہے؟“

”ہمارے خیال میں یہ ناک ہماری نہیں ہے۔“

ہم نے اُنہیں مطلع کیا کہ اُن کے خیال اور اُن کی ناک میں کوئی مطابقت

نہیں ہے۔ اس پر اُنہوں نے یہ جاننا چاہا کہ اگر تصویر کو خوب بڑا کیا، تب بھی ناک چھوٹی نظر آئے گی کیا؟



## پندِ سودمند

دوسرے دن مرزا ایک نئی طرز کے ہوٹل ”مانٹی کارو“ کے بال روم میں اُتاری ہوئی تصویریں دکھانے آئے۔ اور ہر تصویر پر ہم سے اس طرح داد و وصول کی جیسے مرے چوتھے وصول کیا کرتے تھے۔ یہ اسپین کی ایک اسٹریٹ میئر ڈانس (جسے مرزا انڈیسی رقاصہ کہے چلے جا رہے تھے) کی تصویریں تھیں، جنہیں برہنہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ سفید دستانے پہنے ہوئے تھے۔ گرم کافی اور تحسین ناشناس سے ان کی طبیعت میں انشراح پیدا ہونے لگا تو موقع غنیمت جان کر ہم نے ماموں کی زیادتیاں گوش گزار کیں اور مشورہ طلب کیا۔ اب مرزا میں بڑی پرانی کمزوری یہ ہے کہ اُن سے کوئی مشورہ مانگے تو ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے سچ مچ مشورہ ہی دینے لگ جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہماری صورت میں کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ ہر شخص کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ پھر شروع ہو گئے :

”صاحب! آپ کو فوٹو کھینچنا آتا ہے، فوٹو کھینچوانے والوں سے منہنا نہیں آتا۔ سلاستی چاہتے ہو تو کبھی اپنے سامنے فوٹو دیکھنے کا موقع نہ دو۔ بس دبیز لفافے میں بند کر کے ہاتھ میں تھما دو اور چلتا کرو۔ وکٹوریہ روڈ کے چوراہے پر جو فوٹو گرافر ہے۔ لہسنیا ڈاڑھی والا۔ ارے بھئی! وہی جس کی ناک پر چاقو کا نشان ہے۔ آگے کا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اب اُس نے بڑا پیارا اصول بنا لیا ہے۔ جو گاہک دکان پر اپنی تصویر نہ دیکھے، اُسے بل میں ۲۵ فی صد نقد رعایت دیتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ مفت تصویر کھینچتے ہو۔ اور شہر بھر کے بد صورتوں سے گالیاں کھاتے پھرتے ہو۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ تم نے کسی کی تصویر کھینچی ہو اور وہ ہمیشہ کے لیے تمہارا جانی دشمن نہ بن گیا ہو۔“



## کثرتِ اولاد اور یہ فقیر پر تقصیر

نصیحت کی دُھن میں مرزا یہ بھول گئے کہ دشمنوں کی فہرست میں اضافہ کرنے میں  
 خود اُنھوں نے ہمارا کافی ہاتھ بٹایا ہے۔ جس کا اندازہ اگر آپ کو نہیں ہے تو آنے والے واقعات  
 سے ہو جاتے گا۔ ہم سے کچھ دور پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک نامی گرامی ٹھیکیدار تین کوٹھیلوں میں  
 رہتے ہیں۔ مارشل لار کے بعد سے بچارے اتنے رفیقِ القلب ہو گئے ہیں کہ برسات میں کہیں  
 سے بھی چھت کرنے کی خبر آئے، ان کا کلیجہ دھک سے رہ جاتا ہے۔ حلیہ ہم اس لیے نہیں  
 بتائیں گے کہ اسی بات پر مرزا سے بُری طرح ڈانٹ کھا چکے ہیں۔ ”ناک فلیس کے  
 بلب جیسی، آواز میں بنک بلیس کی کھنک، جسم خوبصورت صراحی کی مانند۔ یعنی وسط  
 سے پھیلا ہوا۔۔۔“ ہم نے آؤٹ لائن ہی بنائی تھی کہ مرزا گھائل لہجے میں بولے،  
 ”بڑے مزاح نگار بنے پھرتے ہو تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جسمانی نقائص کا مذاق اڑانا  
 طنز و مزاح ہیں۔“ کروڑ پتی ہیں، مگر انکم ٹیکس کے ڈر سے اپنے کو لکھ پتی کہلاتے ہیں۔ مبدع  
 فیاض نے ان کی طبیعت میں کنجوسی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ روپیہ کمانے کو تو سبھی  
 کلاتے ہیں۔ وہ رکھنا بھی جانتے ہیں۔ کہتے ہیں آمدنی بڑھانے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ  
 خرچ گھٹا دو۔ مرزا سے روایت ہے کہ اُنھوں نے اپنی بڑی بیٹی کو اس وجہ سے جہیز نہیں  
 دیا کہ اُس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی، جو خود لکھ پتی تھا۔ اور دوسری بیٹی کو اس  
 لیے نہیں دیا کہ اُس کا دُلہا دیوالیہ تھا۔ سال چھ مہینے میں ناک کی کیل تک بیچ کھاتا۔  
 غرض کہ لکشی گھر کی گھر میں رہی۔



ہاں، تو انہی ٹھیکیدار صاحب کا ذکر ہے جن کی جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ، منکوحہ وغیرہ منکوحہ کا نقشہ شاعر شیوہ بیاں نے ایک مصرع میں کھینچ کر رکھ دیا ہے :

ایک اک گھر میں توستو کمرے ہر کمرے میں نار

اس حسین صورتِ حال کے نتائج اکثر ہمیں ٹھگتے پڑتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر نو مولود کے عقیقہ اور پہلی سالگرہ پر ہمیں سے یادگار تصویر کھینچواتے ہیں۔ اور یہی کیا کم ہے کہ ہم سے کچھ نہیں لیتے۔ ادھر ڈھائی تین سال سے اتنا کرم اور فرمانے لگے ہیں کہ جیسے ہی خاندانی منصوبہ شکنی کی شبھ گھڑی قریب آتی ہے تو ایک نوکر دانی کو اور دوسرا ہمیں بلانے دوڑتا ہے، بلکہ ایک آدھ دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ جاتی تھی کہ ہم نکلتے۔ جن حضرات کو اس بیان میں شرارتِ ہمسایہ کی کار فرمائی نظر آئے، وہ ٹھیکیدار صاحب کے الہم ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ہمارے ہاتھ کی ایک نہیں درجنوں تصویریں ملیں گی، جن میں موصوف کمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈال کر نو مولود کے کان میں اذان دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آتے دن کی زچگیاں جھیلنے جھیلنے ہم ہلکان ہو چکے تھے، مگر بوجہ شرم و خوش اخلاقی خاموش تھے عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اس کاروبارِ شوق کو کس طرح بند کیا جاتے۔ مجبوراً (انگریزی محاورے کے مطابق) مرزا کو اپنے اعتماد میں لینا پڑا۔ احوال پر ملال سن کر بوجہ صاحب! ان سب پریشانیوں کا حل ایک پھولدار فراک ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! ہم پہلے ہی ستلے ہوئے ہیں۔ ہم سے یہ ابٹر کیٹ گفتگو تو نہ کرو۔ بولے، تمھاری ڈھلنتی جوانی کی قسم! مذاق نہیں کرتا۔ تمھاری طرح ہمسایوں کے لخت ہاتے جگر کی تصویریں کھینچتے کھینچتے اپنا بھی بھر کس نکل گیا تھا۔ پھر میں نے تو یہ کیا کہ ایک پھولدار فراک خریدی اور اُس میں ایک نوزائیدہ بچے کی تصویر کھینچی اور اُس کی تین درجن کا پیاں بنا کر اپنے پاس رکھ لیں۔



اب جو کوئی اپنے نوٹوں کی تصویر کی فرمائش کرتا ہے تو یہ شرط لگا دیتا ہوں کہ اچھی تصویر درکار ہے تو یہ خوبصورت بھولدار فراک پہنا کر کھنچواؤ۔ پھر کمرے میں فلم ڈالے بغیر ٹین دباتا ہوں۔ اور دو تین دن کا بھلا دادے کر اسی ام القیادیر کی ایک کاپی پکڑا دیتا ہوں۔ ہر باپ کو اس میں اپنی شبہت نظر آتی ہے!

## حادثات اور ابتدائی قانونی امداد

ہمارے پرانے جاننے والوں میں آغا واحد آدمی ہیں جن سے ابھی تک ہماری بول چال ہے۔ اس کی واحد وجہ مرزا یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے کبھی ان کی تصویر نہیں کھینچی، گو کہ ہماری فن کارانہ صلاحیتوں سے وہ بھی اپنے طور پر مستفید ہو چکے ہیں۔ صورت استفادہ یہ تھی کہ ایک اتوار کو ہم اپنے ”ڈارک روم“ (جسے پیر سے نیچر تک گھر والے غسلخانہ کہتے ہیں) میں اندھیرا کیے ایک مارپیٹ سے بھرپور سیاسی جلسے کے پرنٹ بنا رہے تھے۔ گھپ اندھیرے میں ایک متناسا سرخ بلب جل رہا تھا، جس سے بس اتنی روشنی نکل رہی تھی کہ وہ خود نظر آجاتا تھا۔ پہلے پرنٹ پر کالی جھنڈیاں صاف نظر آنے لگی تھیں، لیکن لیڈر کا چہرہ کسی طرح ابھر کے نہیں دینا تھا۔ لہذا ہم اسے بار بار چمٹی سے تیزابی محلول میں غوطے دیے جا رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے بھانک کی گھنٹی بجائی اور بجانا چلا گیا۔ ہم جس وقت چمٹی ہاتھ میں لیے پہنچے ہیں تو گھر والے ہی نہیں، پڑوسی بھی دوڑ کر آگئے تھے۔ آغلے ہتھیلی سے گھنٹی کا ٹین دبار کھاتا تھا اور لرزتی کپکپاتی آواز میں حاضرین کو بتا رہے تھے کہ وہ کس طرح اپنی سدھی سدھائی مرخاں مرخج کار\* میں اپنی راہ چلے جا رہے تھے کہ ایک ٹم دن ذاتی

\* اس پرانی کار کا خاکہ ایک دوسرے مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔ سر دست اتنا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)



ہوتی ”رانگ سائیڈ“ سے آئی۔ اور اُن کی کار سے ٹکرا گئی۔ ہمارے منہ سے کہیں نکل گیا، ”مگر تھی تو اپنی ہی پٹری پر؟“ تنقنائے ہوئے بولے ”جی، نہیں! ٹیک آف کر کے آئی تھی!“ یہ موقع اُن سے اُبھنے کا نہیں تھا، اس لیے کہ وہ جلدی مچا رہے تھے۔ بقول اُن کے، رہی سہی عزت خاکِ کراچی میں ٹٹی جا رہی تھی۔ اور اسی کی خاطر ٹکڑے ہونے سے ایک دو سیکنڈ پہلے ہی وہ کار سے کود کر غریب خانہ کی سمت روانہ ہو گئے تھے تاکہ چالان ہونے ہی اپنی صفائی میں بطور دلیل نمبر ۲ حادثہ کا فوٹو مع فوٹو گرافر پیش کر سکیں۔ دلیل نمبر ۱ یہ تھی کہ جس لمحے کار ٹرام سے ٹکرائی، وہ کار میں موجود ہی نہیں تھے۔

ہم جس حال میں تھے، اُسی طرح کیمرا لے کر آغا کے ساتھ ہو لیے اور ہانپتے کانپتے موقع واردات پر پہنچے۔ دیکھا کہ آغا کی کار کا بمپر ٹرام کے بمپر پر چڑھا ہوا ہے۔ آغا حصہ ہوا میں مشعل ہے اور ایک لونڈا پہیا گھما گھما کر دوسرے سے کہہ رہا ہے ”ابے! فضلو! اس کے تو پیٹے بھی ہیں!“

آغا کا اصرار تھا کہ تصویریں ایسے زاویے سے لی جائیں جس سے ثابت ہو کہ پہلے مشعل ٹرام نے کار کے ٹکڑے مارے۔ اس کے بعد کار ٹکرائی! وہ بھی محض حفاظتِ خود اختیاری میں! ہم نے احتیاطاً ملزمہ کے ہر پوز کی تین تین تصویریں لے لیں، تاکہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰) اشارہ کافی ہو گا کہ آغا اس میں نکلے ہوئے اس قدر جھنجھپتے ہیں کہ کبھی ہارن نہیں بجاتے۔ آخر غیروں کے طعنوں اور دوستوں کی بھتیسیوں سے تنگ آکر آغا ایک دن نئی کار خریدنے نکلے۔ بیسیوں کاریں دیکھ ڈالیں۔ صرف ایک پسند آئی۔ کہنے لگے، ”یہ ٹھیک رہے گی۔ اس کا بمپر بہت مضبوط ہے!“ سیلنگرل نے ساٹھ ہزار چار سو قیمت بتائی۔ لیکن سودا نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ آغا کا خیال تھا کہ اس قیمت کی کار کو تو بغیر پٹرول کے چلنا چاہیے۔



ان میں مبینہ زاویہ بھی اگر کہیں ہو تو آجاتے۔ حادثے کو پکچرائز کرتے وقت ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس پیش بندی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ جس زاویے سے مضروبہ ملزمہ پر چڑھی تھی اور جس پینتیرے سے آغانے ٹرام اور قانون سے ٹکرائی تھی اسے دیکھتے ہوئے ان کا چالان اقدام خودکشی میں بھلے ہی ہو جائے، ٹرام کو نقصان پہنچانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادھر ہم کلک کلک تصویر پر تصویر لیے جا رہے تھے، ادھر سڑک پہ تماشائیوں کا ہجوم تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم نے کیمرے میں دوسری فلم ڈالی۔ اور کار کا ”کلوز اپ“ لینے کی غرض سے مرزا ہمیں سہارا دے کر ٹرام کی چھت پر چڑھانے لگے۔ اتنے میں ایک گبر پولیس سارجنٹ بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا۔ آکر ہمیں نیچے اتارا۔ اور نیچے اتار کے چالان کر دیا۔ — شارع عام پر مجمع لگا کے عمار کاوٹ پیدا کرنے کے الزام میں! اور بقول مرزا، وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ وہ وہاں موجود تھے۔ ورنہ ہمیں تو کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملتا۔ کھنچے کھنچے پھرتے۔

## عقدِ ثانی اور عاجز

یہ پہلا اور آخری موقع نہیں تھا کہ ہم نے اپنے حقیر آرٹ سے قانون دانوں کے ہاتھوں کو مضبوط کیا۔ (معاف کیجیے ہم پھر انگریزی ترکیب استعمال کر گئے۔ مگر کیا کیا جاتے! انگریزوں سے پہلے ایسا بھوک بھی تو نہیں پڑا تھا) اپنے بیگانوں نے بارہا یہ خدمت بے مزد ہم سے لی ہے۔ تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ عائلی قانون (جسے مرزا قانون انسداد نکاح کہتے ہیں) کا نفاذ ابھی نہیں ہوا تھا۔ مگر پریس میں اس کی موافقت میں تحریریں اور تقریریں دھڑا دھڑ چھپ رہی تھیں۔ جن کے گجراتی ترجموں سے گڑ بڑا کر ”بنولہ کنگ“ سیٹھ عبدالغفور ابراہیم



ساجی مٹھائیل یونس چھاڑی والا ایک لڑکی سے چوری چھپے نکاح کر بیٹھے تھے۔ حلیہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ اہل بنیش کو اتنا اشارہ کافی ہونا چاہیے کہ اگر ہم ان کا حلیہ ٹھیک ٹھیک بنانے لگیں تو مرزا چیم اٹھیں گے ”صاحب! یہ طنز و مزاح نہیں ہے!“ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حاشا و کلا۔ ہم نے کچھ عرصے سے یہ اصول بنا لیا ہے کہ کسی انسان کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم نے دیکھا کہ جس کسی کو ہم نے حقیر سمجھا، وہ فوراً ترقی کر گیا۔ ہاں، تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جس دن سے تعددِ ازدواج کا قانون لاگو ہونے والا تھا، اس کی ”چاند رات“ کو سیٹھ صاحب غریب خانے پر تشریف لائے۔ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں۔ ان کے ہمراہ وجہ سراسیمگی بھی تھی۔ جو سیاہ برقع میں تھی۔ اور بہت خوب تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ اور کیمبر، اسکرین اور روشنیاں ٹھیک کرتے کرتے

گیارہ بج گئے۔ گھنٹہ بھر تک سیٹھ صاحب ہماری

CANDID FIGURE STUDIES کو اس طرح گھورتے رہے کہ پہلی مرتبہ ہمیں اپنے فن سے حجاب آنے لگا۔ فرمایا، ”اجن بگڑی

باتوں کی پھوٹو گرا پھینے میں تو تم ایک نمبر استاد ہو۔ پن کوئی بھین بیٹی کپڑے پہن کر

پھوٹو کھواتے تو کیا تمیر اکیرا کام کریں گا؟ ہم نے کیمبرے کی نیک چلنی کی ضمانت دی اور

تپائی رکھی۔ تپائی پر سیٹھ صاحب کو کھڑا کیا۔ اور ان کے بائیں پہلو میں دلہن کو (سینڈل

اُتر داکر) کھڑا کر کے فوکس کر رہے تھے کہ وہ تپائی سے چھلانگ لگا کر ہمارے پاس آئے

اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں جس میں گجراتی سے زیادہ گھبراہٹ کی آمیزش تھی، درخواست کی

کہ سمرتی پردے پر آج کی تاریخ کو تلے سے لکھ دی جائے اور فوٹو اس طرح لیا جائے

کہ تاریخ صاف پڑھی جاسکے۔ ہم نے کہا، ”سیٹھ! اس کی کیا تک ہے؟ تپائی پر واپس



چڑھ کے اُنھوں نے بڑے زور سے یہیں آنکھ ماری اور اپنی ٹوپنی کی طرف ایسی بے کسی سے اشارہ کیا کہ یہیں اُن کے ساتھ اپنی عزت آبرو بھی مٹی میں ملتی نظر آتی۔ پھر سیٹھ صاحب اپنا بایاں ہاتھ دھن کے کندھے پر مالکانہ انداز سے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ دایاں ہاتھ اگر اور لمبا ہوتا تو بخدا اُسے بھی وہیں رکھ دیتے۔ فی الحال اُس میں جلتا ہوا سگریٹ پکڑے تھے۔ ہمارا رُئیہ کہنا تھا کہ تپائی سے پھر زقند لگا کر ہم سے لپٹ گئے۔ یا اللہ! خیر! اب کیا لفظ ہے سیٹھ؟ معلوم ہوا، اب کی دفعہ وہ بچشم خود یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیمرے میں کیسے نظر آ رہے ہیں! خوشامدِ درامد کر کے پھر تپائی پر چڑھایا۔ اور قبل اس کے کہ گھڑیاں رات کے بارہ بج کر نئی صبح اور فتانوں انسدادِ نکاح کے نفاذ کا اعلان کرے، ہم نے اُن کے ٹھنیہ رشتہ مناکحت کا مزید دستاویزی ثبوت کو ڈک فلم پر محفوظ کر لیا۔

اصل دشواری یہ تھی کہ تصویر کھینچنے اور کھینچوانے کے آداب سے متعلق جو ہدایات سیٹھ صاحب بربانِ گجراتی یا اشاروں سے دیتے رہے، ان کا منشاء کم از کم ہمارے فہمِ قہص میں یہ آیا کہ دھن صرف اُس لمحے نقاب اُلٹے جب ہم ٹہن دباتیں اور جب ہم ٹہن دباتیں تو عینک اُتار دیں۔ اُن کا بس چلتا تو کیمرے کا بھی لینس اُتر کر تصویر کھینچواتے۔ رات کی جگہ سے طبیعت تمام دن کسمند رہی۔ لہذا دفتر سے دو گھنٹے پہلے ہی اٹھ گئے۔ گھر پہنچے تو سیٹھ صاحب ممدوح و منکوح کو برآمدے میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ گردن جھکائے، ہاتھ پیچھے کو باندھے، بقیارمی کے عالم میں ٹہلے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا، سیٹھ، السلام علیکم! بولے، بالیکم! اپن پھلم کو گسل کب دیں گا؟ ہم نے کہا، ابھی نو، سیٹھ! پھر اُنھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی شریکِ حیات کی تصویر کو ان کی موجودگی میں ”غسل“ دیا جائے۔ ہم نے جگہ کی تنگی کا عذر کیا، جس کے جواب میں سیٹھ صاحب نے



ہمیں نبولے کی ایک بوری دینے کا لالچ دیا۔ جتنی دیر تک فلم ڈولپ ہوتی رہی، وہ فلتش کی زنجیر سے لٹکے، اس گنہ گار کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتے رہے۔

ہم فلمسٹر میں آخری ڈوب دے چکے تو انھوں نے پوچھا ”کلیئر آئی ہے؟“ عرض کیا، بالکل صاف۔ چوبی گیرہ سے ٹپکتی ہوئی فلم پکڑ کے ہم نے انھیں بھی دیکھنے کا موقع دیا۔ شارک اسکن کا کوٹ ہی نہیں، بریٹ پاکٹ کے بٹوے کا ابھار بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ مائیکنگ میٹو میں الٹی تھی، مگر صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ چہرے پر بھی بقول اُن کے کافی روشنائی تھی۔ انھوں نے جلدی جلدی دھن کی انگوٹھی کے نگ گنے اور انھیں پورے پا کر ایسے مطمئن ہوئے کہ خشکی بجا کر سگرٹ چھنگلیا میں دبا کے پینے لگے۔ بولے، ”مشٹر! یہ تو سولہ آنے کلیئر ہے۔“ آٹکھ، ناک، جیب پاکٹ، ایک ایک نگ چلتی سنبھال لو۔ اپنے بھی کھاتے کی موا پھک! آج اپنی اومیگا واچ کی سوئی بھی بروبر ٹھیک ٹیم دیتی پڑی ہے۔ گیارہ کلاک۔ اور اپن کے ہاتھ میں جو ایک ٹھوسگرٹ جلتا پڑا ہے، وہ بھی سالہ ایک دم لیٹ مارتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ کسی گھرے سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر ایک جھٹکے سے چہرہ اٹھا کر کہنے لگے ”بڑے صاب! اس سگرٹ پہ جو سالہ K2 لکھے لائے، اس کی جگہ Player's No. 3 بنا دو نی!“

## دربارِ اکبری میں باریابی

خیر، یہاں تو معاملہ سگرٹ ہی پڑل گیا، ورنہ ہمارا تجربہ ہے کہ سو فی صد حضرات اور ننانوے فی صد خواتین تصویر میں اپنے آپ کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ باقی رہیں ایک فی صد۔ سو انھیں اپنے کپڑوں کی وجہ سے اپنا چہرہ قبولنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر آٹھ سو سے کپڑے بھی اپنے نہ ہوں تو پھر شوقیہ فوٹو گرافر کو چاہیے کہ وقت اور روپیہ برباد کرنے کا



کوئی اور مشغلہ تلاش کرے جس میں کم از کم مارپیٹ کا امکان تو نہ ہو۔ اس فن میں دُرک نہ کھنے والوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے ہم صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ پچھلے سال بغدادی جہم خانہ میں نمبولا سے تباہ ہونے والوں کی امداد کے لیے یکم اپریل کو ”اکبر اعظم“ کھیل جانے والا تھا۔ اور پلیٹی کھیتی نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم ڈریس رہرسل کی تصویریں کھینچیں تاکہ انجارات کو دو دن پہلے مہیا کی جاسکیں۔

ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ چوتھا سین چل رہا تھا۔ اکبر اعظم دربار میں جلوہ افروز تھے اور اُستادان سین مینجور پر حضرت فراغ گورکھپوری کا سہ غزلہ راگ مالکوس میں گارہے تھے۔ جو حضرات کبھی اس راگ یا کسی سہ غزلہ کی لپیٹ میں آچکے ہیں، کچھ دُہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر یہ دونوں یکجا ہو جائیں تو ان کی سنگت کیا قیامت ڈھاتی ہے۔ اکبر اعظم کا پارٹ جہم خانے کے پروپگنڈا سیکریٹری صبغے (شیخ صبغۃ اللہ) ادا کر رہے تھے۔ سر رُپین کا مصنوعی تاج چمک رہا تھا، جس میں سے اب تک اصلی گھی کی لپٹیں آرہی تھیں۔ تاج شاہی پر شیشے کے پیپر پیٹ کا کوہ نور میرا جگمگا رہا تھا۔ ہاتھ میں اسی دھات یعنی اصلی ٹین کی تلوار۔ جسے گھمسان کا دن پڑتے ہی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے وہ کُمال کی طرح چلانے لگے۔ آگے چل کر مہدی گھاٹ کی لڑائی میں یہ تلوار ٹوٹ گئی تو خالی نیام سے دادِ شجاعت دیتے رہے۔ انجام کار یہ بھی جواب دے گیا کہ رانا پرتاپ کا سر اس سے بھی سخت نکلا۔ پھر مہابلی اس کی آخری پتھر تاشائیوں کو دکھاتے ہوئے داروغہ اسلحہ خانہ کو رائج الوقت گایاں دینے لگے۔ حسبِ عادت غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ لیکن حسبِ عادت محاورے کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دوسرے سین میں شہزادہ سلیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ سلیم ابھی انارکلی پر اپنا وقت برباد کر رہا تھا۔ اس کا دور جہانگیر کی، بلکہ نور جہاں گیری ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ دورانِ سرزنش



ظلم سبجانی نے دستِ خاص سے ایک طمانچہ بھی مارا جس کی آواز آخری قہار کے مٹنے کے بعد بھی  
تو انارکلی کے گال پر بھی مارتا تھا، مگر اس کا ذکر ہم نے مصلحتاً نہیں کیا، کیونکہ یہ مہابلی نے کچھ  
اس انداز سے مارا کہ پاس سے تو کم از کم ہمیں ہی لگا کہ وہ دو مینٹ تک انارکلی کا میک اپ  
سے تسمتا ہوا رخسار سہلاتے رہے۔

پانچوں انگلیوں پر گال کے نشان بن گئے تھے!

اکبر: شیخو! انارکلی کا سرتیرے قدموں پر ہے، مگر اس کی نظر تاج پر ہے۔

سلیم: محبت اندھی ہوتی ہے، عالم پناہ!

اکبر: مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت بھی اندھی ہوتی ہے!

سلیم: لیکن انارکلی عورت نہیں، لڑکی ہے، عالم پناہ!

اکبر: (آستین اور تیوری چٹھا کر) اے خاندان تیموریہ کی آخری نشانی! آ

ناخلف، مگر (کلیجہ بکڑکے) اکلوتے فرزند! یاد رکھ، میں تیرا اپ بھی

ہوں اور والد بھی!

اس ڈرامائی انکشاف کو نئی نسل کی آگاہی کے لیے ریکارڈ کرنا از بس ضروری تھا۔

لہذا ہم کیمیرے میں فلیش گن "فٹ کر کے آگے بڑھے۔ یہ احساس ہمیں بہت بعد میں ہوا کہ

جتنی دیر ہم فوکس کرتے رہے، مہابلی اپنا شاہی فریضہ یعنی ڈانٹ ڈپٹ چھوڑ چھاڑ سانس

روکے کھڑے رہے۔ وہ جو سکیخت خاموش ہوتے تو پچھلی شستوں سے طرح طرح کی آواز

آنے لگیں:

"ابے! ڈاٹلاگ بھول گیا کیا؟"

"طمانچہ مار کے بیوش ہو گیا ہے!"



”مہابلی! منہ سے بولو۔“

اگلے سین میں فلمی تکنیک کے مطابق ایک ”فلش بک“ تھا۔ مہابلی کی جوانی تھی اور اُن کی مونچھوں پر ابھی پاؤڈر نہیں بڑکا گیا تھا۔ باغی اعظم، ہیمنو بھال (تماشاہیوں کی طرف منہ کر کے) سجڑے میں پڑا تھا۔ اور حضرت ظلِ سبحانی تلوار سوختے بھٹا سا اُس کا سر اڑانے بارہ تھے۔ ہم بھی ڈرو کھینچنے لپکے۔ لیکن فٹ لائٹس سے کوئی پانچ گز دور ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی — بیٹھ جاؤ، یوسف کارش! اور اس کے فوراً بعد ایک نامہرا ہاتھ نے بڑی بے دردی سے پیچھے سے کرٹ پکڑ کے کھینچا۔ پلٹ کے دیکھا تو مرزا نکلتے۔ بولے ”اے صاحب! ٹھیک سے قتل تو کر لینے دو۔ ورنہ سالہا اٹھ کے بھاگ جاتے گا اور پھر علمِ بغاوت بلند کرے گا!“

دوسرے ایکٹ میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ یعنی قتل نہیں ہوا۔ پانچوں مناظر میں شہزادہ سلیم انارکلی کو اس طرح حالِ دل سُنا تا رہا، گویا ادا لکھ رہا ہے۔ تیسرے ایکٹ میں جیسے ہمارا مطلب ہے، ظلِ سبحانی شاہی پیچان کی گزروں ابھی رہبر کی نئے (جس سے دن میں حجم خانہ کے لان کو پانی دیا گیا تھا) ہاتھ میں تھامے انارکلی پر برس رہے تھے اور ہم حاضرین کی ہونٹوں کے ڈسے ”ونگ“ میں دیکے ہوتے اس سین کو فلما رہے تھے کہ سامنے کے ”ونگ“ سے ایک شیرخوار اسٹیج پر گھٹنیوں چلتا ہوا آیا اور گلا پھاڑ پھاڑ کے رونے لگا۔ بالآخر ماترا، عشق اور اداکاری پر غالب آئی اور اس عقیضہ نے تختِ شاہی کی اوٹ میں حاضرین سے پیٹھ کر کے اس کا منہ قدرتی غذا سے بند کیا۔ ادھر مہابلی خون کے سے گھونٹ پیتے رہے۔ ہم نے بڑھ کر پوچھ گرایا۔

آخری ایکٹ کے آخری سین میں اکبر اعظم کا جنازہ بنیڈ باجے کے ساتھ بڑے



دھوم دھڑکتے سے نکلا۔ جسے فلما نے سے بعد ہم گرین روم میں گئے اور صبح کو مبارکباد دی کہ اس سے بہتر مردے کا پارٹ آج تک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اُنھوں نے بطور شکریہ کورے کفن سے ہاتھ نکال کر ہم سے مصافحہ کیا۔ ہم نے کہا، صبح! اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، مگر اکبر کوہ نور ہیرا کب لگاتا تھا؟ کہنے لگے، جی تو ہم نے نقلی کوہ نور لگایا تھا! ”ڈیولپر“ کو برف سے، ڈگری ٹھنڈا کر کے ہم نے راتوں رات فلم ڈویلپ کی اور دوسرے دن حسب وعدہ تصویروں کے پروف دکھانے جم خانہ پہنچے۔ گھڑی ہم نے آج تک نہیں رکھی۔ اندازاً رات کے گیارہ بج رہے ہوں گے۔ اس لیے کہ ابھی تو ڈیز کی میزیں سجائی جا رہی تھیں اور ان کو زینت بخشنے والے ممبران ”رین بوروم“ (بار) میں اونچے اونچے اسٹولوں پر ٹنگے نہ جانے کب سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی ممبران ہمارے جامِ صحت کی آخری بوند نوش کر چکے، ہم نے اپنے چرمی بیگ سے ”ش پرنٹ“ نکالا کر دکھائے۔ اور صاحب! وہ تو خدا نے بڑا فضل کیا کہ ان میں سے ایک بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ تھا۔ ورنہ ہر ممبر، کیا مرد، کیا عورت، آج ہمارے قتل میں مانخوذ ہوتا۔

ظُلّ سُبْحانی نے فرمایا، ہم نے انارکلی کو اس کی بے راہ روی پر ڈانٹتے وقت آنکھ نہیں ماری تھی۔ شہزادہ سلیم اپنا فوٹو ملاحظہ فرما کر کہنے لگے کہ یہ تو ٹکیٹو ہے! شیخ ابوالفضل نے کہا، نور جہاں بیوۂ شیراز کی تصویر میں ستر پامردان کی نظر آتی ہے۔ راجہ مان سنگھ کڑک کر بولے کہ ہمارے آپ رواں کے انگرکھے میں ٹوڈر مل کی پسلیاں کیسے نظر آ رہی ہیں؟ ملا دو پیازہ نے پوچھا، یہ میرے ہاتھ میں دس انگلیاں کیوں لگا دیں آپ نے؟ ہم نے کہا، آپ ہل جو گئے تھے۔ بولے، بالکل غلط۔ خود آپ کا ہاتھ ہل رہا تھا۔ بلکہ میں نے ہاتھ سے



آپ کو اشارہ بھی کیا تھا کہ کمرہ مضبوطی سے پکڑیے۔ انارکلی کی والدہ \* کہ بڑے گلے ٹھٹھے کی عورت ہیں، تنک کر بولیں، اللہ نہ کرے، میری چاند سی بنو ایسی ہو (اُن کی بنو کے چہرے کو اگر واقعی چاند سے تشبیہ دی جاسکتی تھی، تو یہ وہ چاند تھا، جس میں بڑھیا بیٹھی چرخا کاتتی نظر آتی ہے۔) مختصر یہ کہ ہر شخص شاکی، ہر شخص خفا۔ اکبر اعظم کے نورتن تو نورتن، خواجہ سہرا تک ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

## پیدا ہونا پیسہ کمانے کی صورت کا

ہم سے جم خانہ چھوٹ گیا۔ اوروں سے کیا گلہ، صبحے تک کھینچے کھینچے رہنے لگے۔ ہم نے بھی سوچا، چلو، تم روٹھے، ہم چھوٹے۔ واسر تاکہ اُن کی خفگی اور ہماری فراغت چند روزہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ دس سپرہ دن بعد اُنھوں نے اپنے فلیٹ واقع چھٹی منزل پر ”صبحے ایڈورٹائزرز (پاکستان) پرائیویٹ لمیٹڈ“ کا شوخ ساسن بورڈ لگا دیا، جسے اگر بیچ سڑک پر لیٹ کر دکھایا جاتا تو صاف نظر آتا۔ دوسرا نیک کام اُنھوں نے یہ کیا کہ ہمیں ایک نئے صابن ”اسکنڈال سوپ“ کے اشتہار کے لیے تصویر کھینچنے پر کمیشن (مامور) کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہم خود کچھ عرصے سے بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ ہمارے ہاں عورت عبادت اور شراب کو اب تک کلوروفارم کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی درود اذیت کا \* انارکلی کی والدہ : یہ خود بھی ایک زمانے میں یہودی کی لڑکی کا کردار ادا کر چکی ہیں۔ یاد آیام! اسی رول میں مرزا کی طبیعت ان پر آئی تھی۔ اب بھی بے شمار ”مابعد الطبیعت“ تصویریں موصوف کے اہم میں اُن دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں، جب مرزا فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد فلسفہ کی حدت کو حماقتوں سے معتدل کر رہے تھے۔



احساس مٹانے کے لیے نہ کہ سرور و انبساط کی خاطر۔ اسی احساس کو سن کر دینے والی پنکپ کی تلاش میں تھکے مارے فنون لطیفہ تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ ایسی عیاشی کو ذریعہ معاش نہیں بنایا جاسکتا۔ چنانچہ پہلی ہی بولی پر ہم نے اپنی متاع ہنر سے چھپا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر معاوضہ بھی معقول تھا۔ یعنی ڈھائی ہزار روپے۔ جس میں سے تین روپے نقد انھوں نے ہمیں اسی وقت ادا کر دیے۔ اور اسی رقم سے ہم نے گیورٹ کی ۲۴ ڈگری کی سست رفتار فلم خریدی، جو جلد کے نکھار اور نرمی کو اپنے اندر دھیرے دھیرے سمو لیتی ہے۔ ”سچہ“ مہیا کرنے کی ذمہ داری اسکندل سوپ بنانے والوں کے سر تھی۔ تصویر کی پہلی اور آخری شرط یہ تھی کہ ”سیکسی“ ہو۔ اس مقصد جمیل کے لیے جس خاتون کی خدمات پیش کی گئیں، وہ برقع میں نہایت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ برقع اترنے کے بعد کھلا کہ

خوب تھا پردہ، نہایت مصلحت کی بات تھی

سیکس اپیل تو ایک طرف رہی، اس دکھیا کے تو منہ میں مکھن بھی نہیں گھل سکتا تھا۔ البتہ دوسرا ماڈل کا باکفایت لباس اپنے مضمرات کو چھپانے سے بوجہ قاصر تھا۔ ہم نے چند رنگین شاٹ ٹیکھے ٹیکھے زاویوں سے لیے اور تین چار دن بعد مرزا کو پریجیکٹر سے TRANSPARENCIES دکھائیں۔ کوڈک کے رنگ دکھ رہے تھے۔ سرکش خطوط پکار پکار کر اعلان جنس کر رہے تھے۔ ہم نے اس پہلو پر توجہ دلائی تو ارشاد ہوا، یہ اعلان جنس ہے یا کپڑے کی صنعت کے خلاف اعلان جنگ؟

تیسری ”سٹنگ“ (نشست) سے دس منٹ پیشتر مرزا حسب وعدہ ہماری کمک پر آگئے۔ سوچا تھا، کچھ نہیں تو دوسرا تھ رہے گی۔ پھر مرزا کا تجربہ بسبب اُن طبع زاد غلطیوں کے، جو وہ کرتے رہے ہیں، ہم سے کہیں زیادہ وسیع و گونا گوں ہے۔ لیکن انھوں نے تو آتے ہی آفت مچا



دی۔ اصل میں وہ اپنے نئے رول“ (ہمارے فنی مشیر) میں پھولے نہیں سمارہے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ نیا نوکر دوڑ کر ہرن کے سینگ کیوں اکھاڑتا ہے اور اگر ہرن بھی نیا ہو تو اسدا اللہ خاں قیامت ہے!

ویسے بھی میک اپ وغیرہ کے بارے میں وہ کچھ تعصبات رکھتے ہیں جنہیں اس وقت ماڈل کے چہرے پر تھوپنا چاہتے تھے (مثلاً کالی عورتوں کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ انہیں سفید سرمہ لگانا چاہیے۔ ادھیڑ مرد کے دانت بہت اُبلے نہیں ہونے چاہئیں ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ مصنوعی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس)۔ بولے، لب اسٹک پر ویلین لگواؤ۔ اس سے ہونٹ VOLUPTUOUS معلوم ہونے لگیں گے۔ آج کل کے مرد اُبھرے اُبھرے گردے ہونٹ پہ مرتے ہیں۔ اور ہاں یہ پھیپھڑیں اُتار کے تصویر لو۔ ہم نے رفع شر کے لیے فوراً عینک اُتار دی۔ بولے صاحب! اپنی نہیں اُس کی۔ بعد ازاں ارشاد ہوا، فوٹو کے لیے نئی اور چمکیلی ساری قطعی موزوں نہیں۔ خیر۔ مگر کم از کم سینڈل تو اُتر وادو۔ پُرانا پُرانا لگتا ہے ہم نے کہا، تصویر چہرے کی لی جا رہی ہے، نہ کہ پیروں کی۔ بولے اپنی ٹانگ نہ اُٹاؤ۔ جیسے استاد کہتا ہے فہی کرو۔ ہم نے بگم کاشمپین کے رنگ کا نیا سینڈل لا کر دیا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اسے پہن کر اُس کے ”ایکسپریشن“ میں ایک خاص تمکنت آگتی۔ بولے صاحب! یہ تو جوتا ہے۔ اگر کسی کے بیان میں چھید ہو تو اس کا اثر بھی چہرے کے ایکسپریشن پر پڑتا ہے یہ نکتہ بیان کر کے وہ ہمارے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

آنکھیں میری باقی اُن کا

ایڑی سے چوٹی تک اصلاحِ حُسن کرنے کے بعد اُسے سامنے کھڑا کیا اور وہ پیاری



پیاری نظروں سے کیمرے کو دیکھنے لگی تو مرزا پھر بہن بجانے لگے ”صاحب! یہ فرنٹ پوز، یہ دو کانوں بیچ ایک ناک والا پوز صرف پاسپورٹ میں چلتا ہے۔ آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کی گردن لمبی ہے اور ناک کا کٹ یونانی۔ چہرہ صاف کسے دیتا ہے کہ میں صرف پروفائل کے لیے بنایا گیا ہوں۔“ ہم نے کہا ”اچھا، بابا! پروفائل ہی سہی۔“

اس تکنیکی سمجھوتے کے بعد ہم نے رت پھرت کیمرے میں کلوز اپ لینس ”فٹ“ کیا۔ مرسٹی پردے کو دو قدم پیچھے کھسکایا۔ سامنے ایک سبز کلنٹے دار ”کیکٹس“ رکھا اور اس پر پانچ سو واٹ کی اسپاٹ لائٹ ڈالی۔ اس کی اوٹ میں گل رُخسار۔ ہلکا سا آؤٹ آف فوکس تاکہ خطوط اور ملائم ہو جائیں۔ وہ دسویں دفعہ تن کر کھڑی ہوئی۔ سینہ بفلک کشیدہ، بچلا ہونٹ صوفیہ لارین کی طرح آگے کو نکالے۔ آنکھوں میں ”ادھر دیکھو، مری آنکھوں میں کیا ہے“ دانا کیفیت لیے۔ اور میٹھی میٹھی روشنی میں بل کھاتے ہوئے خطوط پیر گیت گانے لگے۔ رنگ پھر گوکنے لگے۔ آخری بار ہم نے دیدبان سے اور مرزا نے کپڑوں سے پارہ جتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ مسکراتی ہوئی تصویر لینے کی غرض سے ہم نے ماڈل کو آخری پوز پر رانا نہ ہدایت دی کہ جب ہم ٹہن دبانے لگیں تو تم ہرے ہرے کہتی رہنا :

چیز، چیز، چیز، چیز۔

یہ سنا تھا کہ مرزا نے ہمارا ہاتھ کپڑا لیا اور اسی طرح برآمدے میں لے گئے۔ بولے، کتنے فاقوں میں سیکھی ہے یہ ٹرک؟ کیا ریڑ ماری ہے؟ مسکراہٹ کی! صاحب! ہر چہرہ منہ کے لیے نہیں بنایا گیا۔ خصوصاً مشرقی چہرہ۔ کم از کم یہ چہرہ! ہم نے کہا، جناب! غورت کے چہرے پر مشرق مغرب بتانے والا قطب نما تھوڑا ہی لگا ہوتا ہے۔ یہ تو لڑکی ہے بدھ تک کے ہونٹ مسکراہٹ سے خم ہیں۔ لنکا میں ناریل اور پام کے درختوں سے گھری



ہوتی ایک نیلی جھیل ہے جس کے بارے میں یہ روایت چلی آتی ہے کہ اس کے پانی میں ایک دفعہ گوتم بُدھ اپنا چہرہ دیکھ کر یوں ہی مُسکرا دیا تھا۔ اب ٹھیک اسی جگہ ایک خوبصورت مندر ہے جو اس مُسکراہٹ کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ مرزا نے وہیں بات پکڑ لی۔ بولے، صاحب! گوتم بُدھ کی مُسکراہٹ اور ہے، مونا لیزا کی اور! بُدھ اپنے آپ پر مُسکرایا تھا۔ مونا لیزا دوسروں پر مُسکراتی ہے۔ شاید اپنے شوہر کی سادہ لوحی پر! بُدھ کی مُورتیاں دیکھو۔ مُسکراتے وقت اُس کی آنکھیں جھکی ہوتی ہیں۔ مونا لیزا کی کھلی ہوتی۔ مونا لیزا ہونٹوں سے مُسکراتی ہے۔ اُس کا چہرہ نہیں ہنستا۔ اُس کی آنکھیں نہیں ہنس سکتیں۔ اس کے برعکس اجنٹا کی عورت کو دیکھو۔ اس کے لب بند ہیں۔ مگر خطوط کھل کھلتے ہیں۔ وہ اپنے سموچے بدن سے مُسکرا نا جانتی ہے۔ ہونٹوں کی کلی ذرا نہیں کھلتی، پھر بھی اُس کا ہر ابھرا بدن، اُس کا انگ انگ مُسکرا اُٹھتا ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! اس میں اجنٹا ایلورا کا اجبارہ نہیں۔ بدن تو مارلن منرو کا بھی کھلکھلانا تھا! بولے، کون مسخرہ کہتا ہے؟ وہ غریب عمر بھر ہنسی اور ہنسانہ آیا۔ صاحب! ہنسانہ آیا، اس لیے کہ وہ جہنم جہنم کی زندا سی تھی۔ اُس کا رُوں رُوں بلاوے دیتا رہا۔ اس کا سارا وجود، ایک ایک پور، ایک ایک مسام

انتظارِ صید میں اک دیدہ بے خواب تھا

وہ اپنے چپتنا ر بدن، اپنے سارے بدن سے آنکھ مارتی تھی۔ مگر ہنسی؟ اُس کی ہنسی ایک لذت بھری سسکی سے کبھی آگے نہ بڑھ سکی۔ اچھا۔ آؤ۔ اب میں تمہیں بتاؤں کہ ہنسنے والیا کیسے ہنسا کرتی ہیں :-

جات ہتی اک نار اکیلی، سو بیچ بجار بھیو مجراتے  
آپ ہنسی کچھو نہیں ہنسی کچھو نہیں بیچ ہنسو کجراتے



ہمارے بیچ ہمیں ہنسی، باجو بندن بیچ ہنسو گجراتے

بھویں مرور کے ایسی ہنسی جیسے چند کو داب چلو بدلتا

مرزا بھن جاشا کی اس چوپی کا انگریزی ترجمہ کرنے لگے اور ہم کان لٹکاتے سنتے

رہے۔ لیکن ابھی وہ تیسرے مصرعہ کا خون نہیں کر پاتے تھے کہ صبر و ضبط کا پیمانہ

چھلک گیا۔ کیونکہ ماڈل سو روپے فی گھنٹہ کے حساب سے آئی تھی اور ڈیڑھ سو روپے گزر

جانے کے باوجود ابھی پہلی کلک کی نوبت نہیں آئی تھی۔

تصویریں کیسی آئیں؟ تین کم ڈھائی ہزار روپے وصول ہوئے یا نہیں؟ اشتہار

کہاں چھپا؟ لڑکی کا فون نمبر کیا ہے؟ اسکنڈل سوپ فیکٹری کب نیلام ہوئی؟ ان تمام

سوالات کا جواب ہم انشاء اللہ بہت جلد بذریعہ مضمون دیں گے۔ سرورست قارئین کو یہ

معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ مرزا کے جس پالے پوسے نیکٹس کو ہم نے رُخ روشن کے آگے

رکھا تھا، اُسے فردرسی میں پھولوں کی نمائش میں پہلا انعام ملا۔

(جولائی - ۱۹۶۳ء)



# اُردو ادب کی ایک عہد آفریں کتاب

مُشتاق احمد یوسفی  
کے مضامین کا پہلا مجموعہ

## چراغ تلے

Biggest Urdu Literature & CSS books Library

[www.AdabiZouq.com](http://www.AdabiZouq.com)